اسلام میں
خدمتِ خلق کا تصوّر

مولانا سید جلال الدین عمری

مباحث

فہرست مضامین

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اسلام نے جن موضوعات کو خاص اہمیت دی اور جن پر تفصیل سے بحث کی
ہے ان میں خدمتِ خلق کا موضوع بھی ہے۔ اس نے خدمت کی اہمیت واضح کی، اس
ا ترغیب دی، خدمت کا مجمل سا تصور ہی نہیں دیا، بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ کون لوگ ہیں،
ن کی خدمت ہونی چاہیے اور جو ہمارے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں؟ اس نے کہا کہ
ارے مسلمان ایک امت ہیں، انھیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے،
لن یہ حقیقت انھیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود
کے ذمے دار ہیں اور اس ذمے داری کا تقاضا ہے کہ کسی فردِ بشر سے تعصب نہ برتا
ائے اور وقتِ ضرورت اس کی ممکنہ خدمت کی جائے۔ اس نے چھوٹی بڑی ہر طرح کی
دمت کی ترغیب دی تاکہ ہر شخص آسانی سے اس میں اپنا حصہ ادا کرسکے۔ اس کے
اتھ رفاہی خدمات کی اہمیت اجاگر کی اور اس میں فرد اور ریاست دونوں کو شریک کیا۔
دمت کا جذبہ غلط رُخ اختیار کرتا ہے تو بڑی بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں، ان کا
زالہ کیا، خدمت کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انھیں دور کیا اور دین کے

نظامِ فکر و عمل میں اس کا صحیح مقام متعین کیا۔ بے لوث خدمت کا جذبہ ابھارا اور اخلا
کی روح پیدا کی۔

کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ۔
کوشش اس بات کی رہی ہے کہ موضوع سے متعلق آیات و احادیث کا بڑی حد تک اح
ہوجائے اور موقع و محل کی مناسبت سے ان کا صحیح مفہوم واضح ہوجائے۔ اس ضمن :
خدمتِ خلق کے وہ پہلو بھی سامنے آجائیں جن کا موجودہ دور تقاضا کرتا ہے۔ اس پو
بحث میں جہاں ضرورت محسوس ہوئی فقہ، سیرت اور لغت سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اس موضوع پر راقم کا ایک کتابچہ 'انسانوں کی خدمت' کے عنوان سے ۸ے
میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس قدر اہم موض
پر کوئی مستقل تصنیف ہماری زبان میں نہیں تھی۔ امید ہے اس کتاب سے یہ کمی
حد تک پوری ہوسکے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اس .
بندوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

جلال الدین ع

(۴؍فروری ۹۹۰

طبع سوم

اس کتاب کے دو ایڈیشن 'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' علی گڑھ سے شائع
ئے تھے۔ اب کی بار میں نے ایک نظر ڈال کر اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کی
۔ شروع میں کتاب کے تعارف کا اضافہ بھی ہے۔ اب یہ مرکزی مکتبہ اسلامی
شرز، نئی دہلی سے نفیس اور خوب صورت انداز میں پیش ہو رہی ہے۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ The Concept of social service in Islam
نام سے جامعہ دار السلام عمر آباد (مدراس) نے اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ پرمبور، چینئی
اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ 'جن سیوا اور اسلام' مدھر سندیش سنگم،
دہلی۔۲۵ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ ملیالم اور ٹمل ترجمے کافی پہلے سے شائع
ہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک معروف اسکالر نے اس کا ٹمل ترجمہ دیکھ کر کہا کہ 'میں
اسلام سے متعلق بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن سب سے زیادہ اس کتاب سے یہ
قت واضح ہو کر سامنے آئی کہ اسلام نوعِ انسانی کے لیے سراسر باعثِ خیر ہے اور اس
اس کی بھلائی کے لیے بہت ہی وسیع اور موثر اقدامات کیے ہیں'۔

یہ کتاب ادارۂ معارف اسلامی کراچی، پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔
تعالیٰ ان کوششوں کو اپنے فضلِ خاص سے قبول فرمائے، ان کی افادیت کے دائرے کو
ح سے زیادہ وسعت عطا کرے اور اس کے اجر و ثواب میں ہر اس شخص کو شریک
ے، جس کا اس میں تعاون حاصل رہا ہے۔

جلال الدین عمری

۲۷/ مارچ ۲۰۰۷ء

کتاب کا تعارف[1]

اسلام نے سب سے زیادہ زور عقائد اور عبادات پر دیا ہے۔ عقیدہ اگر درست
و اور عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو تو فکر و عمل کا رخ بھی فطری طور
صحیح ہو جاتا ہے اور زندگی صراطِ مستقیم پر گام زن ہونے لگتی ہے۔ عقائد و عبادات کے
ند اسلام نے اخلاق اور قانون کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس نے مکارمِ اخلاق
لی ترغیب دی، انسان کی عظمت و رفعت کے لیے کردار کی بلندی کو ضروری قرار دیا،
ذائلِ اخلاق کی قباحت واضح کی اور ان سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ یہ ایک حقیقت
ہے کہ اخلاق کی پستی انسان کو خدا اور خلق خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہے، وہ کسی اور
ریقہ سے ان کا محبوب نہیں بن سکتا۔ اخلاق ہی کا ایک نمایاں پہلو خدمتِ خلق ہے۔
دمتِ خلق انسانوں کے دکھ درد اور مشکلات میں شریک ہونے کا نام ہے۔ خدمت
ا جذبہ مخلوقِ خدا کی خبر گیری اور غم گساری پر ابھارتا اور اسے سکون و راحت کا
امان بہم پہنچاتا ہے۔

۲۸ر نومبر ۱۹۹۹ء کو مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں اس کتاب کے ہندی ترجمہ 'جن سیوا اور اسلام' (जनसेवा और इस्लाम) کا اجراء عمل میں آیا۔ اس موقع پر راقم نے کتاب اور اس کے مباحث کے تعارف پر مشتمل ایک مختصر سی تحریر پڑھی تھی۔ یہی تحریر کسی قدر نظر ثانی کے بعد یہاں پیش کی رہی ہے۔

اسلام نے شروع ہی سے ظلم و جور کے خلاف آواز اٹھائی، کم زور افراد اور طبقات کے حقوق واضح کیے اور معاشرہ کو ہدایت کی کہ وہ ان حقوق کو مجروح نہ ہونے دے اور ایسی فضا پیدا کرے کہ ہر حال میں یہ حقوق ادا ہوتے رہیں۔ اس کے لیے اس نے بہت ہی جامع اور مستحکم قانون عطا کیا اور ریاست کو اس کے نفاذ کا پابند بنایا۔

خدمتِ خلق اور انسانوں کی فلاح و بہبود کا ذکر کیا جاتا ہے تو کرسچین مشنریز (Christian Missionaries) کا تصور ذہنوں میں ابھر آتا ہے، حالاں کہ اسلام نے نوعِ انسانی کی خدمت کا اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع تصور دیا ہے اور فرد، معاشرہ اور ریاست کو اس میں شریک کیا ہے۔ اس نے جس تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے اور جن پہلوؤں کو ابھارا ہے، اس کی نظیر شاید کہیں نہیں مل سکتی۔ پیش نظر کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' میں اسی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خدمتِ خلق کے جن پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱- خدمت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ ایک معصوم بچہ کی خدمت اس کے والدین اور خویش و اقارب اسی جذبے کے تحت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اس فطری جذبے کو تقویت پہنچاتا ہے۔

۲- ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں نے خدمت خلق کی تعلیم دی ہے۔ سب سے آخر میں قرآن مجید اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف بہ طورِ خاص توجہ دلائی، اس کی سخت تاکید کی، ہم دردی کے جذبات ابھارے اور اسے خدا کی رضا اور خوش نودی کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا۔

۳- اسلام کے نزدیک خدمتِ خلق عبادت ہے۔ قرآن مجید، نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے۔ نماز میں خدا سے براہِ راست تعلق قائم ہوتا ہے اور زکوٰۃ بندگانِ خدا کی خدمت کی ایک صورت ہے۔ اس طرح اس نے دونوں کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس

کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض مواقع پر مالی عبادت کو بدنی عبادت کا بدل قرار دیا گیا ہے۔ بعض حالات میں روزہ کا بدل صدقات ہو جاتے ہیں۔ انفاق اور صدقات کا براہِ راست فائدہ انسانوں کو پہنچتا ہے۔

۴- اسلام نے اپنے ماننے والوں کو صرف اس امت ہی کی خدمت کا حکم نہیں دیا، جس سے ان کا دینی تعلق ہے بلکہ اس کے ساتھ عام انسانوں کی خدمت کی بھی تاکید کی ہے۔

۵- خدمت کی ہدایت کے ساتھ اسلام نے اس بات کی بھی نشان دہی کی ہے کہ وہ کون سے افراد اور طبقات ہیں جو ہماری ہم دردی اور اعانت کے مستحق ہیں؟ ان میں ماں باپ اور رشتہ دار بھی ہیں، جن سے ہمارا خونی رشتہ قائم ہے اور ایسے یتیم، مسکین، ہم سایہ، مسافر، غلام اور محکوم بھی آ جاتے ہیں، جن سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

۶- انسان کی بہت سی ضروریات روپے پیسے اور مال کے ذریعے پوری ہوتی ہیں، اس لیے مال کے ذریعے خدمت کی خاص اہمیت ہے، لیکن خدمت کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے۔ حدیث کی رو سے کسی کا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا، کوئی میٹھا بول بولنا، سواری پر بیٹھنے میں مدد دینا، کسی کا سامان اٹھا کر اسے دے دینا، راستے سے کانٹے، پتھر یا کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا، کسی کو راستہ دکھانا، کسی کے برتن میں پانی بھر دینا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا یہ سب صدقات کی مختلف شکلیں ہیں اور صدقات سے خدمت خلق کی راہ نکلتی ہے۔ اصولی بات یہ بتائی گئی ہے: **کل معروف صدقة** (ہر بھلا کام صدقہ ہے)

۷- خدمت وقتی اور ہنگامی بھی ہوتی ہے، جیسے بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسے کی پیاس بجھانا، یا کھانے کی تیاری کے لیے غلہ، اناج، نمک، ایندھن، برتن جیسی کوئی چیز فراہم کر دینا، جو برہنہ تن ہے اس کے لیے لباس اور پوشاک کا نظم کرنا، مریض کی تیمارداری اور دوا علاج میں حسبِ استطاعت تعاون کرنا وغیرہ۔ بعض اوقات اس وقتی مدد

کی اہمیت بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس سے غفلت، بے حسی اور اخلاقی پستی کی دلیل ہے۔ اسلام نے اس کی طرف خاص توجہ دلائی ہے اور اس میں ہر ایک کو اپنا حصہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۸- اس کے ساتھ اسلام نے نوعِ انسانی کی مشکلات کے پائے دار حل پر زور دیا ہے۔ کسی مسکین اور بیوہ کی وقتی خدمت بھی باعثِ ثواب ہے، لیکن اس کے احتیاج اور پریشانی کو مستقل طور پر رفع کرنے کی کوشش شب و روز کی عبادت کے برابر ہے۔ اسی طرح کسی یتیم کے سر پر محبت اور پیار سے ہاتھ پھیرنا بڑی نیکی ہے، اس سے رقتِ قلب اور گداز پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی معاشی کفالت، تعلیمی اور اخلاقی نگرانی جنت میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ اس بات کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ جو لوگ نادار اور محتاج ہیں انھیں کاروبار سے لگایا جائے یا صنعت و حرفت میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

۹- خدمت کے بہت سے پہلو ہوسکتے ہیں۔ مالی تعاون کرنا، قرض دینا، قرض کی واپسی میں حسبِ حال مہلت دینا، ہبہ کرنا، ہبہ نہ ہوسکے تو کوئی چیز عاریتاً استعمال کے لیے دینا، ضرورت پر ایک جیسی دو چیزیں دینا، جیسے کاشت کے لیے دو بیل، دودھ کے لیے دو گائے یا بھینس، کسی سے اجرت پر کام لینے کی جگہ کاروبار میں اسے شریک کرنا، بٹائی پر کھیتی باڑی میں حصے دار بنانا، مظلوم کی قانونی، اخلاقی اور معاشی مدد کرنا۔ یہ بعض وہ پہلو ہیں، جن کی متعین طور پر احادیث میں نشان دہی کی گئی ہے۔ ان پر دوسرے پہلوؤں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

۱۰- رفاہی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ ان سے بڑے پیمانے پر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ خدمات افراد، ادارے اور حکومت سب ہی انجام دیتے ہیں، جیسے پاکی و صفائی کا اہتمام، سڑکوں کی تعمیر، راستوں کو آسانی سے آمد و رفت کے قابل اور محفوظ و مامون بنانا، پانی کا نظم کرنا، شجر کاری اور پیڑ پودے لگانا۔ اسی میں جنگلات کی حفاظت

ھی آتی ہے۔ زمین کو استعمال کے قابل بنانا، مساجد و مدارس کی تعمیر اور شفاخانوں کا
یام وغیرہ۔ اسلام نے یہ اور اس نوعیت کے رفاہی کاموں کی طرف صرف توجہ ہی نہیں
لائی، بلکہ ان کے لیے اپنی جائداد یا ذرائع آمدنی کو وقف کرنے کی بھی ترغیب دی ہے
راس کے قاعدے وضابطے وضع کیے ہیں۔

۱۱- اسلام اس بات کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ خدمتِ خلق کے ادارے اور
وسائٹیاں قائم ہوں اور اس کے لیے تنظیمیں وجود میں آئیں۔ اس سلسلے میں وہ دیگر
اہب کے ماننے والوں سے بھی تعاون کو جائز قرار دیتا ہے۔

۱۲- اسلام کا ایک خاص تعاون (Contribution) یہ ہے کہ اس نے خدمتِ
لق کے بارے میں پائے جانے والے غلط تصورات اور غلط رویوں کی اصلاح کی۔ اس
نے کہا کہ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ایک
طری ترتیب ہے۔ اس ترتیب کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ماں باپ، بیوی، بچوں اور
شتہ داروں کا حق دوسروں پر مقدم ہے۔ یہ درست نہ ہوگا کہ آدمی خدمت خلق کے جوش
ں اجانب اور دور کے لوگوں کی ضروریات اور ان کے حقوق پر تو توجہ دے اور قریب
ین افراد کے حقوق کو فراموش کر بیٹھے۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہ ہوگی کہ آدمی قریب
کے افراد کی محبت میں سماج کے دوسرے مستحقین کو نظر انداز کردے۔

۱۳- بعض مذاہب نے سماجی زندگی میں ایسا رویہ اختیار کیا ہے کہ امیر و غریب
ں مستقل تقسیم وجود میں آگئی ہے۔ بعض مذہبی گروہوں نے سوال اور گداگری کو پیشہ بنا
لیا ہے۔ اسلام اس رویہ کے خلاف ہے۔ وہ امیر و غریب کی مستقل تقسیم کو ناروا سمجھتا
ہے۔ اس کے نزدیک یہ سراسر ظلم ہے کہ ایک طبقہ مستقل طور پر احتیاج کی زندگی
گزارے، سائل اور گداگر بن کر رہے اور دوسرا طبقہ احسان کرنے والا ہو۔ آدمی بعض
مخصوص حالات میں تعاون کی درخواست بھی کرسکتا ہے، مگر ان حالات سے جلد نکلنے کی
سے لازماً کوشش کرنی چاہیے۔

۱۴- بعض مذاہب میں خدمتِ خلق کو کل دین یا حاصل دین سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدمت ہی ان کا دین و مذہب تھا۔ یہ بھی قابل اصلاح رویہ ہے۔ خدمت خلق کی تمام تر اہمیت کے باوجود اسلام اسے کل دین نہیں، بلکہ جزو دین سمجھتا ہے۔

۱۵- آخری بات یہ کہ اسلام کے نزدیک وہی عمل قابل قبول ہے جو اخلاص اور للّٰہیت پر مبنی ہو۔ جس کام کے پیچھے نام و نمود کا جذبہ اور ریاکاری ہو وہ اس کے دربار سے رد ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک موجبِ عتاب ہے۔ خدمتِ خلق جتنا اہم کام ہے اتنا ہی وہ اخلاص وللّٰہیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں اخلاص کا باقی رکھنا گو مشکل ہے، لیکن اس کے بغیر اجر وثواب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

آئندہ اوراق میں اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

جذبۂ خدمت اور اسلام کا کردار

خدمت ایک فطری جذبہ ہے

اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں انسان اس کی سب سے اشرف اور اعلیٰ مخلوق ہے۔ یہاں اسی کی خدمت کا ذکر ہے۔ جب کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، مسرت کے شادیانے بجنے لگتے ہیں، دور و نزدیک کے احباب کی طرف سے مبارک باد دی جاتی ہے، والدین اور قریبی اعزاء اپنی حیثیت کے مطابق اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ بے زبان اور مجبور و بے بس بچہ کی بھوک پیاس کا خیال رکھا جاتا ہے، اس کے درد اور تکلیف کو سمجھنے اور اسے دور کرنے کی تدبیر کی جاتی ہے، علاج کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی استطاعت کے مطابق بروقت علاج ہوتا ہے، اسے پاک صاف رکھنے اور اس کی گندگی کو دور کرنے میں کوئی تکدّر اور انقباض نہیں محسوس ہوتا۔ ذرا بڑا ہونے پر اس کی شوخی اور شرارت، شور اور ہنگامے کو خوشی خوشی برداشت کیا جاتا ہے، کچھ اور بڑا ہونے پر اس کی تعلیم و تربیت اور ترقی کی فکر ہوتی ہے۔ غرض کوشش اس بات کی رہتی ہے کہ عمر کے ساتھ اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں، اس کی صحیح نشو و نما ہو، خوب پھلے پھولے اور آئندہ چل کر کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اس میں کسی پہلو سے کمی ہو تو اس کے چاہنے اور محبت کرنے والوں کو افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔ بچہ اگر کسی رئیس، حاکم، سرمایہ دار یا زمین دار کا ہو تو خدمت

بھی اسی معیار کی ہوتی ہے۔ اس کی ضروریات اور مطالبات زیادہ اہتمام کے ساتھ پورے کیے جاتے ہیں، اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر ماں باپ اور خویش و اقارب کے علاوہ خادموں اور ماماؤں کی ٹیم کی ٹیم حرکت میں آجاتی ہے اور اسے سکون و راحت پہنچانے کی ممکنہ کوشش ہونے لگتی ہے۔

اس خدمت، ایثار اور قربانی کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ بچہ ہمارا ہے، ہمارا عزیز اور ہمارے خاندان کا فرد ہے۔ اس کی نشو ونما، تعلیم و تربیت اور ترقی میں مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ ایک بالکل فطری جذبہ ہے جو انسان کے اندرون سے ابھرتا ہے۔ قدرت اس کے ذریعے نسلِ انسانی کے بقا کا انتظام کرتی ہے۔ اسی لیے دنیا نے انسان کے اس پاکیزہ جذبہ کی ہمیشہ ستائش کی ہے۔ اس کا کم زور ہونا نسلِ انسانی کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ خدانخواستہ یہ مفقود یا معدوم ہوجائے تو دنیا کی بہار لٹ جائے اور ہر طرف خزاں چھا جائے۔

بچہ کی معصوم فطرت

بچہ سے اس جذباتی تعلق میں اس بات کا بھی بڑا دخل ہے کہ بچہ معصوم سرشت ہوتا ہے۔ اس کا سینہ ان تمام مذموم جذبات سے پاک ہوتا ہے، جو انسانوں کے درمیان دوری پیدا کرتے اور عناد، دشمنی اور فساد کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا کسی چیز پر دعویٰ نہیں ہوتا، اسے کسی سے شکایت اور مخاصمت نہیں ہوتی، وہ چھل کپٹ نہیں رکھتا۔ وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا کہ کسی کو دے سکے، البتہ وہ پیار اور محبت دے سکتا ہے، دیتا ہے، مسکراہٹ بکھیر سکتا ہے، بکھیرتا ہے۔ پھر اس سے کوئی کیوں نہ محبت کرے اور اس سے پرخاش رکھے؟

فطرت سے اِنحراف شروع ہوتا ہے

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بچہ بھی شب و روز اور ماہ و سال طے کرتے ہوئے بڑا ہوتا اور نشو ونما پاتا ہے، شعور کو پہنچتا ہے، شعور میں پختگی آتی ہے،

اس کے اندر اپنی شخصیت اور انفرادیت کا احساس ابھرتا ہے۔ حریتِ فکر اور آزادی کا دور شروع ہوتا ہے، وہ کسی کے خیالات کا پابند نہیں ہوتا، اس معاملہ میں اختلاف عزیزوں اور قرابت داروں تک سے شروع ہو جاتا ہے، اس کے اپنے جذبات ہوتے ہیں، جن میں وہ رکاوٹ پسند نہیں کرتا، وہ دوسروں کی خواہشات کا پابند نہیں ہوتا، اس کی ذاتی خواہشات ہوتی ہیں، جو اسے اپنے ساتھ لے چلتی ہیں، اس کے اندر اپنے حقوق کا احساس شدت سے جاگ اٹھتا ہے، ان سے وہ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا، وہ اپنے مفادات کی ہر قیمت پر حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ کچھ آگے بڑھتا ہے اور آہستہ آہستہ حرص و ہوس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے بسا اوقات اسے غلط طریقے اور ناجائز تدابیر اختیار کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ خلوص کی دولت اس سے چھن جاتی ہے، اس کے اقدامات بے غرض اور بے لوث نہیں ہوتے، وہ اپنے مفادات کے پیش نظر لوگوں سے ربط قائم کرتا اور معاملہ کرتا ہے۔ اس کی دوستی اور دشمنی اسی کے تابع ہوکر رہ جاتی ہے۔ دوسرے بھی اسے مفادات کے بندے ہی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اپنا حریف اور مخالف تصور کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح محبت، ہم دردی، خدمت اور ایثار و قربانی کا ماحول رفتہ رفتہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو جذبات کی پوری دنیا زیر و زبر ہوکر رہ جاتی ہے۔ قریبی عزیزوں، سگے بھائیوں، یہاں تک کہ ماں باپ اور اولاد میں نزاعات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوستی کی جگہ دشمنی، ایثار کی جگہ انتقام اور خدمت کی جگہ اذیت لے لیتی ہے۔ جو بچہ محبت کے پھول بکھیر رہا تھا وہ نفرت کے شعلے برسانے لگتا ہے اور جو افراد اسے سینہ سے لگائے ہوئے تھے انھیں اس کی قربت ناگوار گزرتی ہے۔

اسلام کا اصلاحی کردار

دنیا کے مختلف مذاہب نے کوشش کی ہے کہ انسان کو زندگی بھر وہی محبت ملے جو اس دنیا میں آتے وقت اسے ملتی ہے اور مفادات کا ٹکراؤ اس محبت کو ختم نہ کرے۔ وہ

کم زور اور ناتواں ہو تو اس کی خدمت کی جائے اور جب وہ توانا اور طاقت ور ہو تو دوسروں کی خدمت کرے، وہ بے بس اور بے اختیار ہو تو اسے سہارا دیا جائے اور اس کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار آئے تو وہ دوسروں کا سہارا بن جائے۔ اس معاملے میں اسلام نے بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ اسی کی تھوڑی سی وضاحت یہاں کی جا رہی ہے۔

خدا سے تعلق خدمت کے جذبہ کو مستحکم کرتا ہے

اس میں شک نہیں کہ انسان کے اندر خدمت کا جذبہ موجود ہے، لیکن ذاتی اغراض، شخصی اور گروہی مفادات اور نفسانی خواہشات اس جذبے پر غالب آ جاتے ہیں اور انسان کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا رویہ اختیار کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ کبھی تو وہ درندگی اور بہیمیت پر اتر آتا ہے۔ اسلام کے نزدیک خلوصِ دل سے خدائے تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تعلق کے ذریعے انسان ان کم زوریوں پر قابو پا سکتا ہے، اس لیے کہ انسانوں کی خدمت کا رشتہ خدا کی عبادت سے جڑا ہوا ہے۔ جس دل میں خدا کی محبت موج زن ہوگی وہ اس کے بندوں کی محبت سے خالی نہ ہوگا۔ خدا سے انسان کا تعلق جس قدر استوار ہوگا، بندوں سے اس کا تعلق اسی قدر مضبوط ہوگا۔ چناں چہ قرآن مجید جب انسانوں کے حقوق، ان کی خدمت، اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کرتا ہے تو اس کے آگے پیچھے اللہ تعالیٰ کی عبادت، تقویٰ یا نماز کا ذکر کرتا ہے۔[1] یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تعلق انسان کے اندر بندوں کے حقوق پہچاننے اور ان کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس تعلق کے کم زور اور مضمحل ہونے کے بعد ان حقوق کے ادا کرنے میں غفلت اور کوتاہی لازماً پیدا ہوگی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اور اس کے شب و روز کے احسانات کو بھول بیٹھے وہ بڑی آسانی سے بندوں کے احسانات کو فراموش کر سکتا ہے۔ ان کے حقوق کا اس کے ہاتھوں ضائع ہونا ہرگز تعجب خیز نہ ہوگا۔

---

[1] اس کی متعدد مثالیں کتاب میں موجود ہیں۔

ُدا کے نیک بندے خلوص سے خدمت کرتے ہیں

قرآن مجید نے پوری انسانی تاریخ کا تجربہ ہمارے سامنے رکھا ہے کہ جن ۔گوں میں خدا کا خوف ہوتا ہے اور جو صحیح معنوں میں اس کے عبادت گزار ہوتے ہیں، ۔سانوں کے ساتھ ان کا رویہ بھی ہم دردی اور خیر خواہی کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کا حق نہیں ۔رتے، کسی پر دستِ تعدی دراز نہیں کرتے، ظلم و ناانصافی سے ان کا دامن پاک ہوتا ہے ۔ور کسی ذاتی غرض یا خارجی دباؤ کے بغیر وہ انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی دنیوی مفاد نہیں ہوتا، وہ اسے شہرت اور نام وری کا ذریعہ نہیں بناتے اور اس ۔دبیر یا بہانے سے لوگوں کو قریب کرنا اور ان پر اپنی حکم رانی اور سیادت قائم کرنا نہیں چاہتے، بلکہ اسے ایک فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی رضا کے طالب ہوتے ہیں اور اسی سے صلہ کی تمنا کرتے ہیں۔ ان کے دشمن بھی ان کی شرافت، تہذیب، اخلاق، ہم دردی اور خیر خواہی کی گواہی دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب بھی انسان خدا کے خوف سے بے نیاز ہوا، اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ اس کا رویہ غلط ہوگیا۔ وہ عدل و انصاف سے پھر گیا، ظلم و زیادتی کی راہ اختیار کی اور دوسروں کے حقوق تلف کیے۔ غرض یہ کہ ہر وہ زیادتی کی جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔[1]

---

[1] بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ خدمتِ خلق کے لیے خدا اور مذہب پر ایمان ضروری نہیں ہے، اس کے بغیر بھی خدمت ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ثبوت میں مغربی قوموں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے پوری دنیا میں زبردست رفاہی کام کیے ہیں۔ اس کا جواب ہماری اس وضاحت میں پوشیدہ ہے کہ انسان کی فطرت میں اپنے ابناء نوع کی خدمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہ اسی کا اظہار ہے، لیکن جب اس جذبے سے ذاتی اور قومی مفادات ٹکراتے ہیں تو وہ مضمحل ہوکر رہ جاتا ہے اور اس کے بالکل منافی روش انسان اختیار کرتا ہے۔ چناں چہ یہی اقوامِ مغرب جن کی رفاہی خدمات کا ہر طرف چرچا ہے اپنے مفادات کی خاطر مخالف قوموں کی معاشی ناکہ بندی کرتی ہیں، ان پر سیاسی دباؤ قائم رکھتی ہیں اور جبر و استحصال کے تمام ممکن حربے استعمال کرتی اور انھیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہیں۔ خدا پرستی اسی سے افراد اور اقوام کو محفوظ رکھتی ہے اور خدمت کے فطری جذبے پر مفادات کو غالب آنے نہیں دیتی۔

خدمت کے لیے جذبات کی پاکیزگی ضروری ہے

خدمت کے لیے انسان کے سینہ کو پاکیزہ جذبات کا مرکز ہونا چاہیے۔ وہ صحیح معنی میں اسی وقت خدمت کرسکتا ہے جب کہ اس کے اندر ہم دردی، رحم و کرم، ایثار قربانی، عفو و درگزر، صبر و تحمل، اخلاص اور بے غرضی جیسی اخلاقی خوبیاں پائی جائیں او حرص، لالچ، بغض و حسد، ظلم و جبر اور مکر و فریب جیسی کم زوریوں پر وہ قابو پالے، ورنہ خدمت کا حق ادا نہ ہوگا اور کبھی کوئی خدمت ہوگی بھی تو آلائشوں سے پاک نہ ہوگی۔ اسلام انسان کو اعلیٰ اخلاقیات سے آراستہ کرتا اور رذائلِ اخلاق سے بچاتا ہے۔ اس اخلاقی تربیت کے لیے اس کے نزدیک تبلیغ و تلقین اور ترغیب و ترہیب کا ایک پورا نظام ہے۔ وقتِ ضرورت وہ قانون سے بھی مدد لیتا ہے۔

اقتدار خدمت کے لیے ہے

اس دنیا میں انسان کو طاقت، قوت، دولت، ثروت، حکومت اور اقتدار اس لیے نہیں ملتا کہ وہ دوسروں کو غلام بنائے اور اپنی حکم رانی کا ڈنکا پیٹے، بلکہ جس دائرہ میں اسے وسائل و ذرائع حاصل ہوں اس میں اس کا امتحان ہے کہ یہ وسائل اللہ کے بندوں کے کام آتے ہیں یا نہیں؟ وہ ان کے حقوق پہچانتا ہے یا نہیں؟ یہ وسائل و ذرائع جتنے زیادہ ہوں امتحان بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ ذیل کی آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (الانعام:۱۶۵)

وہ اللہ ہی ہے، جس نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مقابلے میں بعض کے درجے بلند کیے تاکہ اس نے جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔ بے شک تمھارا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ غفور و رحیم ہے۔

غدمت جبر سے پاک ہو

اس دنیا میں خدمت لی بھی جاتی ہے اور کی بھی جاتی ہے۔ جہاں خدمت
ا جاتی ہے وہاں بسا اوقات جبر کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، ظلم و زیادتی ہوتی ہے، استحصال
وتا ہے، حقوق مارے جاتے ہیں، جذبات مجروح ہوتے ہیں اور انسان کی عزت خاک
بں مل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جب دراز ہوتا ہے تو غلامی کے حدود کو چھونے لگتا ہے۔ اسلام
ر طرح کے جبر و ظلم کے خلاف ہے اور اسے مٹا دینا چاہتا ہے۔

خدمت باعث توقیر ہے

یہی خدمت اگر خلوص اور محبت سے ہو، اس کے ساتھ ذلیل اغراض وابستہ نہ
ہوں تو خدمت کرنے والے کے لیے وہ عزت و توقیر کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے حق
یں محبت اور احترام کا جذبہ ابھرتا ہے، اس کی عظمت محسوس کی جاتی ہے اور وہ دلوں پر
حکومت کرنے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے۔

ہر کہ خدمت کرد مخدوم گشت

جہاں تک آخرت کا تعلق ہے، جو خدمت اخلاص کے ساتھ انجام پائے اس
کے اجر و ثواب کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟ وہ بے پایاں اور بے حساب ہوگا۔ اس محدود دنیا
میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

اسلام اور بندگانِ خدا کی خدمت

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اخلاق کا موضوع ہے۔ خلاقیات سے تعلق رکھنے والے تمام مکاتبِ فکر نے اسے اپنی تعلیمات میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح دنیا کے سب ہی مذاہب نے اس کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ اس کی تصدیق ور تائید ان کے نوشتوں اور صحیفوں سے ہوتی ہے۔

خدمتِ خلق پیغمبروں کی تعلیم میں

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے بہت سے پیغمبروں اور ان کی تعلیمات کے بہ کثرت حوالے دیے گئے ہیں۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل کے اسرائیلی پیغمبروں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ان پیغمبروں نے بنو اسرائیل سے انسانوں کے حقوق پہچاننے، ان کی خدمت اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا بھی عہد لیا تھا۔ اس عہد کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ

یاد کرو جب ہم نے بنو اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے اور (اسی طرح) قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی (حسن سلوک کرو گے) اور عام لوگوں کے

اِلَّا قَلِيۡلاً مِّنۡكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ۝ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ لاَ تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ وَلاَ تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِنۡ دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ۝

(البقرۃ:۸۳،۸۴)

ساتھ اچھی طرح بات کروگے۔ نماز قائم کروگے اور زکوٰۃ دوگے لیکن سوائے چند ایک کے تم سب اس سے پھر گئے اور یہ بھی یاد کرو کہ ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو گھروں سے نکال کر بے گھر نہ کروگے۔ پھر تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تم اس کی شہادت بھی دیتے ہو۔

یہ آیات صراحت کرتی ہیں کہ بنو اسرائیل سے ایک تو اللہِ واحد کی عبادت او انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کا عہد لیا گیا تھا۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ ان کا دامن ہمیشہ ظلم زیادتی سے پاک رہے گا۔ حسنِ سلوک کا ظلم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔ انسانوں ک خدمت کا پاک جذبہ، بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ جو شخص دوسروں ک خون بہاتا پھرے وہ ان کے زخموں کے لیے مرہم نہیں فراہم کرے گا۔ اسی طرح خدمت کرنے والا ہاتھ جور وستم کے لیے نہیں اٹھے گا۔ یہ مختلف کردار ہیں اور مختلف جذبات کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ خدمت سے قوموں کی زندگی وابستہ ہے اور ظلم نے بڑی بڑی جابر اور سرکش قوموں کی کمر اس طرح توڑ کر رکھ دی کہ ان میں سے بہت سی قوموں کو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ بنو اسرائیل نے اس حیات آفریں عہد و پیمان کی قدر نہیں کی۔ اسے توڑتے اور پامال کرتے رہے۔ انھوں نے خدا کی کتاب کے بعض احکام پر عمل کیا اور بعض کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اپنی ہی قوم کے لوگوں کو قتل کیا، انھیں گھروں سے نکالا اور اس مقصد کے لیے دشمنوں تک سے ساز باز اور ان کی مدد کی۔ اس سے ان کی قوت اور وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ انھیں دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑی اور آخرت کے عذاب میں بھی وہ بری طرح پکڑے جائیں گے۔ (البقرۃ:۸۵)

قرآن اور خدمتِ خلق

قرآن مجید نے خدا کے ان برگزیدہ بندوں کی تعلیمات کو جذب کرکے اپنے

راق پر پھیلا دیا ہے۔ اس نے اپنے آغازِ نزول ہی سے بنیادی عقائد کے بعد، دو
وں پر خاص طور سے زور دیا۔ ایک یہ کہ انسان کا خدا سے تعلق مضبوط ہو۔ وہ صرف
ں کی عبادت کرے اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے۔ دوسرے یہ کہ
سانوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور حق داروں کا حق پہچانے، ماں باپ کے
اتھ حسنِ سلوک کرے، قرابت داروں، ہمسایوں، یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی
ضرورتیں پوری کرسکتا ہے پوری کرے، کوئی بھی شخص جو اس کی خدمت کا مستحق ہو اور
ں کی خدمت کرنا اس کے امکان میں ہو، وہ اس کی خدمت سے محروم نہ رہے۔ وہ
قت ور ہے تو کم زوروں پر دست درازی نہ کرے، بلکہ ان کو سہارا دے اور ان کی
قویت کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی اپنے جان و مال اور
زت و آبرو کی طرح حفاظت کرے، کسی کے ساتھ دھوکے اور فریب کا معاملہ نہ کرے،
ہ ہر حال میں عدل و انصاف اور دیانت و امانت پر قائم رہے۔ اس کا وجود معاشرہ کے
یے کلفت و آزار کا باعث نہ ہو، بلکہ آسائش و راحت کا سبب بنے، اس کی ذات سے
ب کو نفع پہنچے اور کسی کو ضرر نہ اٹھانا پڑے۔ قرآن مجید نے ان باتوں کو اس قدر اہمیت
ی ہے کہ بار بار کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔ اس کا
ک بڑا اچھا اور عمدہ نمونہ ہمیں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ملتا
ہے۔ فرمایا گیا: اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ماں باپ کے
تھ حسنِ سلوک کرو، وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو خصوصیت سے ان کا خیال رکھو۔ ان
ے سامنے تواضع اور خاک ساری کے ساتھ جھک جاؤ۔ درشتی اور سختی سے نہ پیش آؤ اور
ن کے لیے دعائیں کرتے رہو، قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو۔ اگر
ی غربت اور افلاس کی وجہ سے ان کی مدد نہ کرسکو تو نرمی سے معذرت کردو۔ اپنی اولاد کو
ی خطرے سے نہ مار ڈالو کہ تم ان کو کچھ کھلا نہ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں بھی کھلائے گا
انھیں بھی کھلائے گا۔ قتل اور وہ بھی اپنی اولاد کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔ زنا کے قریب

نہ پھٹکو، یہ بے حیائی کا کام اور زندگی کا غلط راستہ ہے۔ اللہ نے انسان کی جان کو باعز
اور محترم ٹھہرایا ہے، اس لیے جب تک حق و انصاف کا تقاضا نہ ہو، اس کے خون ـ
اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرو۔ یتیم کو بے آسرا سمجھ کر اس کا مال نہ کھاؤ۔ جب وہ جوان ہوجا۔
تو اس کا مال اس کے حوالے کردو۔ عہد و پیمان کو پورا کرو۔ خدا کے ہاں اس کے بار۔
میں باز پرس ہوگی، ناپ تول میں کمی نہ کرو، جس بات کا تمھیں علم نہیں ہے اس ـ
بارے میں زبان نہ کھولو۔ یاد رکھو! کان، آنکھ، دل اور دماغ ہر ایک کے بارے میں
کے ہاں سوال ہوگا۔ تکبر اور غرور کی چال نہ چلو۔ تم نہ ٹھوکر مار کر زمین کا سینہ چا
کر سکتے ہو اور نہ سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ باتیں تمھارے رب ـ
نزدیک ناپسندیدہ ہیں[1]

قرآن و حدیث میں خدمت خلق پر ایک نہیں متعدد پہلوؤں سے توجہ دلائی گئ
اس پر زور دیا گیا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ یہاں ان میں سے بعض کی وضاحت ہوسکے

خدا کی نعمتوں کا اعتراف

اس دنیا میں کچھ انسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں اور
انسان ان سے محروم ہیں۔ قرآن مجید کا پہلی قسم کے انسانوں سے مطالبہ ہے کہ وہ دوسری
کے انسانوں کی خدمت کریں۔ ان کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں اور ان کی زندگ
خوش گوار بنانے میں مدد دیں۔ جس شخص کو خدا نے دیکھنے کے لیے آنکھ، سننے کے ـ
کان، بولنے کے لیے زبان، دوڑ دھوپ کرنے اور محنت مشقت کے لیے مضبوط دست و با
سوچنے سمجھنے کے لیے دل و دماغ اور زندگی گزارنے کے لیے سامانِ عیش عطا کیا ـ
اس کا فرض ہے کہ جو شخص معذور ہے، جس کو وسائلِ حیات میسر نہیں ہیں اور جو زندگی

---

[1] بنی اسرائیل: ۲۳-۳۸۔ یہی مضمون کسی قدر اختصار کے ساتھ سورۂ انعام (۱۵۱-۱۵۲) میں ب
ہوا ہے۔ یہاں جن باتوں کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک ایک پر قرآن مجید نے مت
مقامات پر زور دیا ہے۔ اس کی مثالیں اسی کتاب کے اوراق میں ملیں گی۔

تگ و دو میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہے اس کو بے سہارا نہ چھوڑ دے کہ وہ بھیک مانگے یا خودکشی کرنے پر مجبور ہوجائے، بلکہ اس کے زندہ رہنے کا ساز و سامان اور اس کے سکون و راحت کے اسباب فراہم کرے، اس لیے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لیے اسے اسی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس کے شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور جو خدمت کے مستحق ہیں ان کی خدمت کی جائے۔ خدا کی دی ہوئی ہر نعمت میں اس کے بندوں کا حق ہے۔ اس حق کو ادا کیے بغیر اس کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے پانے کے بعد اگر کسی کے اندر اس کی مخلوق کی خدمت کا جذبہ نہ اُبھرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دل ان نعمتوں کے احساس ہی سے خالی ہے۔ قرآن مجید نے اس بے حسی پر سخت سرزنش کی ہے اور اس کے برے انجام سے آگاہ کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۝ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ؗ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ؕ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ؕ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ؕ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝ؑ (البلد:۸-۲۰)

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور اس کو (حق و باطل کی) دونوں راہیں نہیں دکھادیں؟ لیکن وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا؟ تم جانتے ہو یہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کا چھڑانا (غلام آزاد کرانا) یا فقر و فاقہ کے دن کھانا کھلانا، قرابت والے یتیم کو یا بدحال مسکین کو۔ پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے، جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور (انسانوں کے ساتھ) رحمت و شفقت کے سلوک کی تاکید کی۔ یہی لوگ ہیں جو (قیامت کے دن خدا کے) دائیں جانب ہوں گے اور جنھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ بائیں جانب والے ہیں۔ ان پر چاروں طرف سے آگ بند ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بے شمار احسانات کیے ہیں۔ ان آیات میں ان میں سے بعض نمایاں احسانات کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آنکھ، کان، اور دل و دماغ کی بے نظیر قوتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ اسے ایک دشوار گزار گھاٹی طے کرنی ہے۔ وہ ہے غلاموں کو آزاد کرنا اور یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا۔ ان کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایمان والوں میں شامل ہوجائے جو عملاً اس گھاٹی کو طے کر رہے ہیں اور جو اس کی نصیحت بھی کر رہے ہیں، جن کا رویہ مظلوموں، محکوموں، بھوکوں اور پیاسوں کے ساتھ محبت اور ہم دردی کا ہے اور جو اس ہم دردی کی دوسروں کو تلقین و تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ راستہ جنت کا ہے۔ اس کی مخالفت کرنے والے جہنم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ قیامت کے روز اسی میں پہنچیں گے۔ پھر اس کے دروازے اس طرح بند کردیے جائیں گے کہ وہ اس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔

بندگانِ خدا کی خدمت خدا کی خدمت ہے

اسلام نے مخلوق کی خدمت کو خالق کی خدمت سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے کہا خدا کے بندوں کی مدد کرنا حقیقت میں خدا کی مدد کرنا ہے۔ ان کے کام آنا خدا کے کام آنا ہے۔ اگر آپ کے روبرو خدا کا کوئی بندہ ہاتھ پھیلائے اور آپ اس کا ہاتھ خالی لوٹا دیں تو گویا آپ نے خدا کے ہاتھ کو خالی لوٹا دیا۔ کوئی مریض آپ کی مدد کا محتاج ہو اور آپ نے اس کی مدد سے انکار کیا تو گویا خدا کی مدد سے انکار کیا۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بندوں کو خوش کیا جائے اور ان کو راحت پہنچائی جائے۔ آسمان والا اپنی رحمتیں اسی وقت نازل کرتا ہے جب کہ زمین والوں پر رحمت و شفقت کا سلوک کیا جائے۔ ایک حدیث میں اس حقیقت کو بہت ہی موثر اور دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار پڑا رہا لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان گھبرا کر

عرض کرے گا اے میرے رب! تو سارے جہاں کا پروردگار، تو کب بیمار تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے لیکن اس کے باوجود تو اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں گیا۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر خدائے تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، انسان عرض کرے گا اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا۔ لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ انسان عرض کرے گا اے دونوں جہاں کے پروردگار! تو کب پیاسا تھا اور میں تجھے پانی کیسے پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا لیکن تو نے اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔[1]

خدمت خلق کی عظمت اور اہمیت کے لیے یہ بات بہت کافی ہے کہ وہ خالق کی خدمت ہے اور اس سے پہلو تہی کرنا خالق کی خدمت سے غفلت کے ہم معنی ہے۔

ہر حال میں خدمت کا جذبہ

اسلام یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ انسان اس طرح زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے خیر کے چشمے جاری ہوں، اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں اور مالی وسائل دوسرے انسانوں کے کام آئیں، اپنی حدِ استطاعت کے اندر وہ ان کی مادی اور اخلاقی مدد کرے، وہ گھر سے فتنہ و فساد پھیلاتا ہوا نہ نکلے، بلکہ انسانوں کے خیر خواہ اور فلاح و بہبود چاہنے والے کی

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل عیادۃ المریض۔

حیثیت سے سامنے آئے، وہ جہاں بیٹھے امن وسلامتی کا پیغام بکھیرتا رہے، دوسروں کی مشکلات کو دور کرے اور ان کی دینی اور اخلاقی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔

اسلام فرد کو معاشرہ کی مادّی اور اخلاقی خدمت پر جس طرح ابھارتا اور اس کا جذبہ اس کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوسکتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی علیہ صلی اللہ نے فرمایا:

ایّاکم والجلوسَ علی الطرقات فقالوا ما لنا بد انما ھی مَجَالِسُنَا نتحدَّث فیھا، قال فاذا اَبیْتُم الا المجالِسَ فَاَعْطُوا الطریقَ حقَّھا قالوا وما حقُّ الطَّریقِ قال غَضُّ البصر و کفُّ الاَذیٰ و رَدُّ السَّلام وامرٌ بالمعروفِ و نھیٌ عن المنکر[1]

راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمارے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، یعنی بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہماری مجلسیں ہیں، ان میں ہم بات چیت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم بیٹھنا ضروری سمجھتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے سوال کیا کہ راستے کا حق کیا ہے؟ ارشاد ہوا نگاہیں نیچی رکھنا، ایذا رسانی سے بچے رہنا، سلام کا جواب دینا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا۔

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ بعض اور صحابہؓ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابوطلحہؓ کی روایت میں ''سلام کا جواب دینا'' کے بعد ''حسن کلام'' کا ذکر ہے۔[2] حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حدیث کے آخر میں ''ارشاد السبیل'' کا اضافہ ہے[3] اس کے معنی راستہ دکھانے کے ہیں۔ ایک اور روایت میں ''تُغِیْثُوا الْمَلْھُوْفَ وَ تَھْدُوا

---

[1] بخاری، کتاب المظالم والقصاص، باب افنیۃ الدور والجلوس فیھا، مسلم، کتاب السلام، باب من حق الجلوس فی الطریق رد السلام

[2] مسلم، حوالہ سابق

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات

الضال" کے الفاظ ملتے ہیں[۱] یعنی راستے میں جہاں تم بیٹھے ہو کسی کو فریاد کرتے دیکھو تو فریاد رسی کرو اور بھٹکنے والے کو راستہ دکھاؤ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ معاشرہ کی طرف سے ایک مومن پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کا اسے راستے اور بازار میں، مجلسوں اور محفلوں میں ہر جگہ خیال رکھنا چاہیے۔ وہ دوسروں کی عفت و عصمت کا پاسبان ہے، اسے کسی پر بری نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے، وہ دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، اس کی ذات سے کسی کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچنی چاہیے۔ آمد و رفت میں رکاوٹ ڈالنا، گندگی پھیلانا، راہ گیروں سے الجھنا اور بد زبانی کرنا، غرض یہ کہ ایذا رسانی کی جو بھی صورتیں ہوسکتی ہیں ان سب سے اس کا دامن پاک ہونا چاہیے۔ کوئی اس پر امن وسلامتی کی دعا بھیجے تو فوراً اسے اس کا جواب دینا چاہیے تاکہ وہ اس کی طرف سے اطمینان محسوس کرے۔ پھر یہ کہ وہ جہاں بیٹھے معروف کی تلقین کرے اور منکر سے روکے۔ اس سے معاشرہ میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ برائیوں سے محفوظ رہے گا۔ جب کوئی شخص کوئی غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کرے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ سوسائٹی میں اس کا احتساب کرنے کی طاقت موجود ہے۔ راستہ کا یہ بھی حق ہے کہ آدمی بد زبانی اور تلخ کلامی کا مظاہرہ نہ کرے، بلکہ اس کے اندازِ تخاطب میں شرافت اور پاکیزگی پائی جائے اور شیریں کلامی کے ساتھ ہر ایک سے پیش آئے۔ اس سے بازار کے بہت سے جھگڑے اور ہنگامے ختم ہوسکتے ہیں۔ مصیبت زدوں کی مدد کرنا اور بھٹکنے والوں کو راستہ دکھانا بھی اس کی ذمے داری ہے۔

اس طرح اسلام نے ترغیب بھی دی اور تاکید بھی کی کہ معاشرہ کا جو فرد بھی کسی کے دکھ درد میں کام آسکتا ہے ضرور کام آئے، وہ بھوکا پیاسا اور لباس کا محتاج ہے تو اسے کھانا، پانی اور کپڑا فراہم کرے، وہ بے گھر ہے تو اس کی رہائش کا انتظام کرے، وہ بیمار

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات

ہے تو اس کا علاج اور تیمار داری کرے، وہ بے روزگار ہے تو اسے روزگار سے لگائے۔ وہ جاہل اور ناخواندہ ہے تو اسے علم و حکمت سے آراستہ کرے اور وہ مظلوم ہے تو دوسروں کی چیرہ دستی سے اس کی حفاظت کرے۔ اس جذبے کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے اس نے ظلم و زیادتی کی مذمت کی، اس کی قباحت واضح کی اور اس بات پر زور دیا کہ کوئی بھی شخص کسی کی کم زوری، ناتوانی، غربت اور جہالت کا استحصال نہ کرے، بلکہ اسے نفع پہنچانے اور اس میں جو نقص اور کمی رہ گئی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے، اسے کسی تکلیف میں گرفتار دیکھ کر خوشی نہ محسوس کرے بلکہ اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے اور جن مصائب میں وہ گھرا ہوا ہے ان سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔ اس طرح اسلام ایک ایسا معاشرہ فراہم کرتا ہے جس میں ظلم کے خلاف شدید نفرت پائی جائے، اور ہر طرف عدل و احسان کے جذبات کی حکم رانی ہو۔

انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی ہر کوشش اسلام کے نزدیک عبادت ہے۔ آئندہ باب میں اس کی تفصیل ملے گی۔

خدمت بھی عبادت ہے

قرآن مجید نے عبادت کو انسان کا مقصدِ حیات قرار دیا ہے (الذاریات:۵۶) عبادت اللہ تعالیٰ سے تقرب اور اس کی رضا جوئی کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ بدنی بھی ہوتی ہے اور مالی بھی۔ بدنی عبادت زبان کے الفاظ وکلمات اور جسم کی حرکات وسکنات کے ذریعے انجام پاتی ہے اور مالی عبادت میں انسان زر و مال کا نذرانہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرتا ہے۔ مالی عبادت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد خلقِ خدا کی خدمت، نصرت اور اس کا تعاون ہے۔ بدنی عبادت میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کو انسان آسانی سے محسوس کرتا ہے، لیکن مالی عبادت میں اس تعلق کا اسے ذرا کم ہی احساس ہو پاتا ہے۔ اسے محسوس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عبادت کے جذبے سے خدمت انجام دی جائے اور کسی بندۂ خدا کی دست گیری کے وقت خدا سے قربت کا تصور زندہ رہے۔ اس سے مادی و معاشی فلاح کے کام انجام دیتے ہوئے بھی انسان کو عبادت کا کیف وسرور حاصل ہوسکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کوئی دنیا داری کا عمل نہیں، بلکہ عین عبادت ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کے پورے نظامِ عبادت کو سامنے رکھنا ہوگا۔

نماز اور زکوٰۃ کا تعلق

نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت۔ نماز بندے کی طرف سے خدا کی

عظمت و بزرگی اور اپنی عبدیت کا اعلان ہے اور زکوٰۃ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے دل میں ہم دردی اور غم خواری کا جذبہ موجود ہے اور وہ دوسروں کے لیے اپنا مال صرف کرسکتا ہے۔ قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ کا بالعموم ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ دونوں پر یکساں زور دیا ہے اور ان کی بار بار تاکید کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالی عبادت بھی اس کے نزدیک بدنی عبادت سے کم اہم نہیں ہے۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے وہ جس طرح بدنی عبادت کو ضروری سمجھتا ہے اسی طرح مالی عبادت کو بھی لازم قرار دیتا ہے۔ وہ جس دین کا مطالبہ کرتا ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کے دربار میں عقیدت و محبت کے ساتھ جھک جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی کمائی ہوئی دولت میں خدا کے بندوں کا حق تسلیم کرے اور ضرورت مندوں پر خرچ کرے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۬ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۝ (البیّنۃ:۵)

ان کو بس اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے یکسو ہوکر۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی مضبوط دین ہے۔

آیت میں اخلاص اور یک سوئی کے ساتھ عبادت کا حکم دینے کے بعد اس کی تشریح نماز اور زکوٰۃ سے کی گئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کی پابندی ہی سے حقِ عبادت ادا ہوسکتا ہے۔ ان خوبیوں کے بغیر عبادت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر عبادت کے ساتھ 'خیر' کا لفظ آیا ہے جو زیادہ جامع ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ۚ السجدۃ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور خیر پر عمل کرو اس سے امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔ (الحج:۷۷)

یہاں عبادت سے پہلے رکوع، سجدہ یا یوں کہیے نماز کا حکم دیا گیا ہے اور عبادت کے بعد 'خیر' پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں 'خیر' سے صلۂ رحمی اور اعلیٰ اخلاق مراد ہے[۱] یہ سارے اعمالِ خیر عبادت کے اندر آجاتے ہیں۔ ان کا الگ سے ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ان کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت عبادت سے الگ نماز کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ حالاں کہ اس کے عبادت بلکہ عینِ عبادت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

قرآن مجید میں نماز، زکوٰۃ اور عملِ خیر کے بعد عبادت کا ذکر اس طرح بھی آیا ہے کہ اس کے دامن میں یہ تمام نیکیاں سمٹ آئی ہیں۔ ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خانوادہ کے بعض پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ۝ (الانبیاء:۷۳)

اور ہم نے ان کو امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے۔ اور ہم نے ان پر وحی کی تھی نیک کاموں کے کرنے کی، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی۔ وہ ہمارے عبادت گزار (بندے) تھے۔

انسانوں کی خدمت اور بھلائی کے جو کام انجام دیے جاتے ہیں ان کی عظمت اور برتری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کی عبادت بن جاتے ہیں۔

روزہ کا فدیہ

مالی عبادت بعض اوقات بدنی عبادت کا بدل بن جاتی ہے اور بدنی عبادت

---

[۱] امام رازی اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خیر پر عمل کی دو شکلیں ہیں۔ ایک ہے اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجا لانا اور دوسری ہے اس کے بندوں کے ساتھ احسان اور شفقت کا معاملہ کرنا۔ گویا نماز کے بعد عبادت کا وسیع تر حکم دیا گیا اس کے بعد خیر کا حکم ہے جو اس سے بھی زیادہ وسیع معنی اور مفہوم کا حامل ہے (تفسیر کبیر جلد ۱۲، جزء ۲۳، ص ۶۳)۔ اگر عبادت کے معنی صرف پرستش کے نہیں بلکہ پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں تو اس کا دائرہ بھی خیر کے دائرہ کی طرح بہت وسیع ہوجائے گا۔ عبادت کے یہی وسیع معنی صحیح ہیں۔

میں جو نقص اور کمی رہ جائے اس کی بھی اس سے تلافی ہوتی رہتی ہے۔

نماز کی طرح روزہ ایک بدنی عبادت ہے، جس میں انسان اللہ تعالیٰ کے لیے بھوکا پیاسا رہتا اور اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک ابتدائی حکم یہ ہے:

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۸۴)

اور جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اور نہیں رکھتے ان کا فدیہ یہ ہے کہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ پھر جو کوئی خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ روزہ رکھو تو یہ تمھارے حق میں بہت اچھا ہے، اگر تم جانو۔

جو شخص روزہ رکھ سکتا تھا اسے بھی اس آیت کی رو سے اجازت تھی کہ روزہ نہ رکھے اور اس کے عوض کم از کم ایک مسکین کو کھانا کھلادے۔ اس سے زیادہ مسکینوں کی خدمت کر سکے تو مزید باعثِ ثواب ہوگا، البتہ اس کی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ روزہ رکھنا بہرحال بہتر ہے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ ہوگئی اور رمضان کے روزے سب پر فرض کردیے گئے۔ البتہ مسافر اور مریض کو اجازت دی گئی کہ وہ چھوٹے ہوئے روزوں کی بعد میں قضا کرلیں۔ (البقرۃ:۱۸۵)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی پابندی سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اپنے بڑھاپے یا کسی سخت مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ رکھتے ہوں۔ ان کے لیے فدیہ کا حکم باقی رکھا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو دونوں وقت کھانا کھلا دیں۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ نہ رکھ سکتے ہوں، ان کے لیے مال کا فدیہ اس کا بدل ہے۔ وہ مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرکے روزے کے فرض سے سبک دوش ہوجاتے ہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن کثیر، تفسیر: ۱/۲۱۴-۲۱۵

وزہ اور صدقۂ فطر

رمضان کے روزوں کے بعد صدقۂ فطر رکھا گیا ہے اور اس کی حکمت حضرت بداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ الفطر طھرۃً للصیام من اللغو و الرفث و طعمۃً للمساکین[1]

رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر فرض کیا ہے جو روزہ کو لغو حرکتوں اور ناپسندیدہ باتوں سے پاک کرتا ہے اور اس میں مسکینوں کی روزی ہے۔

روزوں میں اتفاق سے یا غیر شعوری طور پر کبھی نہ کبھی لغو اور بے ہودہ حرکتیں ہی جاتی ہیں۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ صدقۂ فطر کے ذریعے مسکینوں کی جو تھوڑی سی دہوتی ہے اس سے ان کی آلائش دھل جاتی ہے اور وہ پاک صاف ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے کے بعض اور احکام یہاں بیان کیے جارہے ہیں جن میں مالی عبادت و بدنی عبادت کے مساوی یا اس کا بدل قرار دیا گیا ہے۔

ج میں جب فدیہ واجب ہوتا ہے

نماز اور روزہ کی طرح حج خالص بدنی عبادت نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں ں بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے بدنی اور مالی عبادت کا حسین امتزاج اس میں یا جاتا ہے اور وہ دونوں کی اہمیت ظاہر کرتا ہے، لیکن مالی عبادت کے مقابلے میں اس کا نی عبادت ہونا زیادہ نمایاں ہے۔ حج سے متعلق ارشاد ہے:

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ

حج اور عمرہ اللہ کی رضا کے لیے پورا کرو۔ اگر تم راستہ میں روک دیے گئے (بیماری یا راستہ کی خرابی کی وجہ سے) تو قربانی کا جو جانور میسر ہو اسے (یا اس کی قیمت) بھیج دو اور اس وقت تک اپنے سر نہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الفطر

الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۧ (البقرۃ:۱۹۶)

منڈواؤ (احرام نہ کھولو) جب تک قربانی کا جانور اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو (اپنا سر منڈوالے اور) اس کا فدیہ دے۔ روزہ یا صدقہ یا قربانی کا۔ پھر جب تم کو امن کی حالت نصیب ہو (خواہ درپیش خطرہ ٹل گیا ہو یا خطرہ پیش ہی نہ آیا ہو) اور جو عمرہ اور حج کو ساتھ ملا کر فائدہ اٹھائے تو جو قربانی میسر ہو وہ کرے۔ اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات روزے حج سے واپسی کے بعد۔ یہ پورے دس روزے ہوئے۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مسجد حرام کے پاس نہ ہوں (بلکہ وہ اپنی میقات سے باہر کا رہنے والا ہو) اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس آیت میں حج سے متعلق جو احکام بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں محسوس ہوتی، البتہ موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق جو بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ کہ حالت احرام میں بال منڈوانا منع ہے۔ آیت میں فرمایا گیا ہے اگر کسی تکلیف کی وجہ سے بال منڈوانے پڑیں تو آدمی روزے یا قربانی یا صدقے کی شکل میں فدیہ ادا کردے۔ اس میں مالی اور بدنی عبادتیں برابر ہوگئی ہیں۔ اسی طرح جو شخص حج میں تمتع یا قران کرے اسے قربانی کا حکم دیا گیا ہے اور قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو دس روزے رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ظہار سے رجوع کا طریقہ

عرب میں رواج تھا کہ لوگ بیوی سے ناراض ہوتے تو اسے ماں کے مثل قرار دے کر ازدواجی تعلقات ہمیشہ کے لیے توڑ لیتے تھے۔ اسے ظِہار کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اس بے ہودگی پر تنقید کی اور کہا کہ بیوی کبھی ماں نہیں ہوسکتی۔ اس سے رجوع کا

ریقہ ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (المجادلۃ:۳،۴)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں اور پھر اپنی اس بات سے رجوع کرنا چاہیں جو انھوں نے کہی تھی تو انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس حکم کے ذریعے تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اللہ تم جو کچھ کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ لیکن جو شخص غلام نہ پائے اسے پے درپے دو مہینوں کے روزے رکھنے ہوں گے، قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

آیت میں ظِہار سے رجوع کا طریقہ یہ بیان کیا گیا کہ پہلے بہ طور کفارہ ایک غلام آزاد کیا جائے، اس کی استطاعت نہ ہو تو لگا تار ساٹھ روزے رکھے جائیں، اور یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ اس کے بغیر بیوی سے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔

قتلِ خطا کے احکام

اسی قسم کے احکام قتلِ خطا کے سلسلے میں دیے گئے ہیں۔ اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو اسے ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کی دیت بھی اس پر واجب ہوگی۔ اگر یہ مسلمان کسی ایسی ریاست کا فرد ہے جس سے اسلامی ریاست کی جنگ ہے تو صرف مسلمان غلام آزاد کیا جائے گا۔ دیت نہیں دی جائے گی (اس لیے کہ اس کے ورثاء محارب قوم کے افراد ہیں) ہاں اگر مقتول جس ریاست کا شہری ہے اس سے اسلامی ریاست کا معاہدۂ صلح ہو تو طے شدہ دیت بھی

دی جائے گی اور ایک مسلمان غلام بھی آزاد کیا جائے گا۔ (مقتول مسلمان ہو یا کافر عورت ہو یا مرد، غلام ہو یا آزاد اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)۔ اس کے بعد فرمایا:

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (النساء:۹۲)

اگر کوئی شخص غلام نہ پائے تو پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر توبہ کا طریقہ ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

مقتول کی دیت تو قاتل اور اس کے خاندان والے ادا کریں گے۔ البتہ قاتل غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے مسلسل دوماہ کے روزے رکھنے ہوں گے۔ بغیر کسی عذر شرعی کے وہ ان کا تسلسل نہیں توڑے گا[1]

قسم کا کفارہ

قسم کسی بات کی تاکید اور اپنے عزم کے اظہار کے لیے ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز مقصود نہ ہو تو قسم کھانا بے معنی اور لغو ہوگا۔ اس کے توڑنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا، البتہ کسی بات کو مستحکم کرنے کے لیے جو قسم کھائی جائے اس کے توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ کفارہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ (المائدۃ:۸۹)

اس کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا، جس شخص کو ان میں سے کسی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

---

[1] جو شخص روزے رکھنے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو اس کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا، جیسا کہ ظہار کے سلسلے میں بیان ہوا ہے۔ لیکن ایک دوسری رائے یہ ہے کہ یہاں صرف روزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شخص روزے نہ رکھ سکے اس کے بدل کے طور پر مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کے لیے صحیح نہیں ہے۔ خازن، تفسیر: ۱۴۳/۲، مع تفسیر البغوی: ۱۳۱/۲

ان تمام احکام میں غلام آزاد کرنے، مسکینوں کو کھانا کپڑا دینے اور قربانی کے
ریعے غریبوں کی مدد کرنے کو بعض پہلوؤں سے روزہ کے مساوی حیثیت دی گئی ہے یا
سے ان کے بدل کے طور پر رکھا گیا ہے۔

خدا سے انسان کے تعلق کو قائم اور مضبوط کرنے میں بدنی عبادت کو غیر معمولی
یت حاصل ہے۔ اس کے بغیر کسی کو خدا کا قرب کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید
نے خدمتِ خلق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو بعض عبادات کا بدل قرار دے کر اور اس
کے ذریعے ان کی کمی کو دور کر کے اسے وہ مقام عطا کر دیا ہے کہ مذہب کے نظام میں
س سے بلند تر مقام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

خدمت سب کی کی جائے

خودغرض افراد

اس دنیامیں آپ کو ایسے انسان بھی ملیں گے جن کے سامنے صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ ہر کام میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں، کسی دوسرے کے مفاد سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ ہر ایک سے فائدہ تو اٹھانا چاہتے ہیں، لیکن کسی کے کام آنا نہیں چاہتے۔ کسی کے دکھ درد اور مصیبت سے انھیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی اور اس کی خدمت کا جذبہ ان میں نہیں ابھرتا۔ اگر ابھرتا بھی ہے تو اسے مختلف بہانوں سے دبانے میں وہ کامیاب ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے جیتے ہیں اور یہی اغراض زندگی بھر ان کی تگ و دو کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ ان سے کسی نفع کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔

اسیرِ اہل وعیال

بہت سے لوگوں میں خدمت کا تو جذبہ ہوتا ہے لیکن نظر محدود ہوتی ہے۔ انھیں اپنی ذات کی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بیوی بچوں، خاندان اور قبیلہ والوں سے تعلق خاطر ہوتا ہے، لیکن یہی تعلق دوسرے وسیع تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنے قریب ترین افراد کا مفاد ہوتا ہے، ان ہی کی فلاح و بہبود کے بارے میں وہ سوچتے ہیں اور ان ہی کی خدمت میں شب و روز لگے رہتے ہیں۔ ان کے

علاوہ کسی کے سود و زیاں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔

اسلام نہ تو فرد کی اہمیت کم کرتا ہے اور نہ خاندان اور قبیلہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس نے دونوں کے حقوق اور ذمے داریاں واضح کردی ہیں، البتہ وہ خدمت اور بھلائی کا وسیع تصور دیتا ہے۔ وہ یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ ایک مسلمان پر اس کی ذات اور اس کے خاندان ہی کے حقوق نہیں عائد ہوتے بلکہ وہ معاشرہ بھی اپنے حقوق رکھتا ہے، جس کا وہ ایک فرد ہے۔ اس معاشرہ کی تعمیر امت کے تصور کے تحت ہوئی ہے۔[1]

امت کی خدمت

اسلام کے ماننے والے تمام افراد ایک امت ہیں۔ ان کے درمیان دینی اخوت پائی جاتی ہے۔ خونی رشتہ کے بغیر بھی وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کے اختلاف کے باوجود ان میں کا ہر فرد اپنے حقوق رکھتا ہے۔ وہ چاہے قرابت دار ہو یا نہ ہو، ہم سایہ ہو یا غیر ہم سایہ، مزدور اور کاریگر ہو یا تاجر اور صنعت کار، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، اجنبی ہو یا شناسا، اس کے یہ حقوق محفوظ ہیں۔ اسے ان سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ ان حقوق میں نصح و خیر خواہی، محبت اور ہم دردی، وقتِ ضرورت خدمت، مشکلات میں تعاون اور حسنِ سلوک داخل ہے۔ اس کی فضیلت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من نفّس عن مؤمنٍ كُربةً من كُرَبِ الدنيا نفَّسَ اللّٰهُ عنه كَرُبَةً من كَربِ يَومِ القيامةِ و من يَسّر على معسرٍ يسر الله عليه	جو شخص دنیا میں کسی مومن کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا، جو شخص کسی مشکل میں پھنسے ہوئے آدمی کو آسانی فراہم کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانی فراہم

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کا باب 'غلط تصورات کی اصلاح'

فی الدنیا والاٰخرة و من ستر مسلما ستره الله فی الدنیا والاٰخرة، والله فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه[1]

کرے گا۔ جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

اس حدیث میں کسی مسلمان کی مشکلات میں کام آنے اور وقتِ ضرورت اس کے ساتھ تعاون کرنے کا اجر وثواب بیان ہوا ہے۔ اسلام نے اس تعاون کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ پوری امت کو جسدِ واحد کی طرح باہم مربوط دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے کسی بھی عضو کے درد کو پورا جسم محسوس کرے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔[2]

اُمت کے تصور سے قومیت کا جذبہ نہیں ابھرتا

یہاں ایک خیال پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح امت کے تصور کو ابھارنے اور اس کی خدمت اور فلاح و بہبود پر اس قدر زور دینے سے قومی جذبات نشو ونما پاتے ہیں اور انھیں تقویت ملتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے اس لیے کہ قومی جذبات جہاں پرورش پاتے ہیں وہاں اس میں شک نہیں کہ قوم کا تشخص باقی رہتا ہے، بڑے پیمانہ پر اس کی خدمت اور اچھی طرح اس کے مفادات کی حفاظت ہوتی ہے، لیکن اس سے قومی تعصب اور تنگ دلی بھی ابھرتی ہے۔ آدمی یہی نہیں کہ اپنی قوم کے مفاد کے سوا کسی دوسری قوم کے مفاد کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ اس کے خلاف اس کا ذہن کام کرنے لگتا ہے۔ قومیت کے تصور سے مختلف اقوام کے درمیان دوری پیدا ہوئی ہے اور ان کے فاصلے بڑھے ہیں۔ مفادات کے تصادم نے عداوت اور دشمنی کی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ اسلام کے تصور امت سے قومیت کے جذبات ابھریں تو اس کی ستائش نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کا مقالہ 'اہل ایمان کے باہمی تعلقات' مطبوعہ ماہ نامہ 'زندگی نو' نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۹ء

یہ ایک بے بنیاد خیال ہے، جس کا اسلام کے تصورِ امت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی قوم یا جماعت کے افراد کو اس بات کی ترغیب دینے سے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کریں، مشکلات میں کام آئیں اور آپس میں تعاون اور ہم دردی کا رویہ اختیار کریں، اس کے اندر تعصب ہرگز نہیں پیدا ہوسکتا۔ یہ اس قوم کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا اور اس کی ایسی اخلاقی تربیت ہے، جو کسی دوسرے فرد یا جماعت کے ساتھ ہم دردی اور حسنِ سلوک کی راہ میں مانع نہیں ہے۔ جس طرح آدمی اپنے خاندان اور قبیلہ کا ہم درد ہوتے ہوئے پوری قوم کے ساتھ ہم دردی کا رویہ اختیار کرسکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کے اندر اپنی قوم کا بھی درد ہو اور وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے بھی بے چین ہو۔

پوری نوعِ انسانی کی خدمت

اسلام اپنے ماننے والوں کو امت کا ہم درد بنانے کے ساتھ تمام انسانوں کا بھی ہم درد بناتا ہے۔ تعصب آدمی کو نفرت اور عداوت سکھاتا ہے۔ جو شخص قومی تعصب میں گرفتار ہو وہ اپنی قوم کے سوا کسی دوسری قوم کے ساتھ ہم دردی اور محبت کا روا دار نہیں ہوتا۔ اسلام اس کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے نزدیک خدا کی مخلوق اس کا کنبہ ہے جو ان کی جتنی خدمت کرے وہ اس کا اتنا ہی محبوب ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الخلق کلھم عیال اللہ و احبّھم الیہ انفعھم لعیالہ[1]	مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے۔ اس میں وہ شخص اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچائے۔

قرآن مجید نے مسکینوں، محتاجوں، معذوروں، یتیموں اور وسائل سے محروم

---

[1] رواہ ابو یعلی والبزار باسناد ضعیف (التیسیر بشرح الجامع الصغیر:۱/۵۲۵) وعزاہ صاحب المشکوۃ الی البیہقی۔ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا ہے، کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ صرف مسلمانوں یا انسانوں کے کسی خاص گروہ اور جماعت کی خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدمت پوری نوعِ انسانی کی ہو، اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی، ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کی بھی اور ان لوگوں کی بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ بھی اس کے مستحق ہیں جو ہماری زبان بولتے ہیں اور وہ بھی جن کے اظہارِ خیال کا ذریعہ دوسری زبان ہے۔ نوعِ انسانی کا ہر فرد اس بات کا حق رکھتا ہے کہ آلام و مصائب میں اسے تنہا تڑپنے نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے درد و کرب کو محسوس کیا جائے اور امکان کی حد تک اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے کہ رنگ، نسل، قوم اور وطن کے فرق کے باوجود ع

بنی آدم اعضاء یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

احادیث میں یہ حقیقت بہت نمایاں ہے۔ ذیل میں چند حدیثیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱- حضرت جریر بن عبد اللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس[۱]	اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔

۲- حضرت عبد اللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء[۲]	رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے (لہٰذا) زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

۳- حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] بخاری، کتاب التوحید، باب قل اعوذ باللہ الخ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمۃ الصبیان والعیال الخ

[۲] ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی رحمۃ الناس

نے ارشاد فرمایا:

لن تؤمنوا حتی ترحموا — تم ہرگز ایمان والے نہیں ہوگے جب تک کہ تم رحم نہ کرو۔

فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص رحم کرتا ہے۔ آپؐ فرمایا:

انه لیس برحمة احدکم صاحبه و لکن رحمة الناس العامة [1] — اس سے وہ رحم اور ہم دردی مراد نہیں ہے جو تم میں سے کوئی اپنے قریب کے آدمی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہاں اس رحمتِ عامہ کا ذکر ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

۴- حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تنزع الرحمة الا من شقی [2] — رحم اور ہم دردی تو اسی شخص کے سینہ سے نکال دی جاتی ہے جو بدبخت ہو۔

۵- حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور اکرمؐ نے ان کے پاس پہنچ کر فرمایا کہ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں بھلا کون ہے اور برا کون؟ آپؐ کے اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے، لیکن جب آپؐ نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد ہو ہم میں بھلا کون ہے اور برا کون؟ آپؐ نے فرمایا:

خیرکم من یرجی خیره و یؤمن شره و شرکم من لا یرجی خیره ولا یؤمن شره [3] — تم میں بہترین شخص وہ ہے، جس سے خیر کی توقع کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ رہیں اور تم میں بدترین شخص وہ ہے، جس سے خیر کی توقع نہ کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ رہیں۔

ان احادیث میں کسی فرق اور امتیاز کے بغیر خدا کی ساری مخلوق کے ساتھ

---

[1] اخرجه الطبرانی و رجاله ثقات۔ فتح الباری: ۱۰/ ۳۲۷

[2] مسند احمد: ۲/۳۰۱، ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس

[3] مسند احمد: ۲/۳۶۸۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب بغیر عنوان

حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو شخص بھی ہماری ہم دردی اور مدد کا محتاج ہے اس کی مدد کی جانی چاہیے۔ اس معاملے میں انسانوں کو گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم کرنا یا اپنے اور پرائے، شناسا اور اجنبی، ہم مذہب اور دوسرے مذہب والے کے درمیان فرق کرنا اور کسی کو خدمت اور حسنِ سلوک کا مستحق سمجھنا اور کسی کے اس حق کو تسلیم نہ کرنا اسلام کے مزاج اور اس کی ہدایت کے سراسر خلاف ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ان احادیث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ خدمتِ خلق کی اہمیت بیان کرتی ہیں، جو کام شب و روز کی عبادت کے برابر ہو، جس سے انسان خدا کا محبوب بن جائے، جو اسے خدا سے قریب کردے، جس کی وجہ سے اس کی رحمت نازل ہو، جو سنگ دلی اور شقاوت جیسی اخلاقی خرابیاں دور کرنے کا ذریعہ ہو، جو اسے نیک اور صالح اور معاشرہ کا بہترین فرد بنا دے، اس کی عظمت و اہمیت سے ایک مسلمان کیسے انکار کرسکتا ہے؟ اس کے لیے اس میں اتنی بڑی ترغیب ہے کہ اس کے بعد وہ مزید کسی ترغیب کا محتاج نہیں رہتا۔

خدمت اور حسنِ سلوک کے یہ مستحق ہیں

اسلام کی یہ تعلیم گزشتہ صفحات میں وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ معاشرہ میں جو بھی شخص خدمت کا مستحق ہو اس کی خدمت ہونی چاہیے، اس سے آگے اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ خدمت اور حسنِ سلوک کے مستحق کون ہیں؟ انسان کو ماں باپ، بیوی بچوں اور قرابت داروں سے فطری طور پر محبت ہوتی ہے۔ وہ ان سے ایک طرح کا قلبی تعلق محسوس کرتا ہے، اس وجہ سے ان کی خدمت کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے، لیکن معاشرہ کے دوسرے افراد سے اس طرح کی جذباتی وابستگی اسے نہیں ہوتی، اس لیے اس کا رویہ بھی ان کے سلسلے میں مختلف ہوتا ہے۔ اسلام انسانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت، ان کے درجات اور مراتب کی پوری رعایت کرتا اور ان کے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ان ہی افراد کی خدمت کو اپنا فرض نہ سمجھے، جن سے اس کا خونی رشتہ ہے، بلکہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی بہتر سے بہتر سلوک کرے، جن سے اس کا کوئی رشتہ اور قرابت نہیں ہے۔ اس کی خدمت اور حسنِ سلوک کا دائرہ اس کے گھر اور خاندان سے بڑھ کر پوری سوسائٹی تک پھیل جائے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو اپنا کنبہ سمجھ کر اس کی خدمت کے لیے کھڑا ہو جائے۔ سورۂ نساء کی ایک آیت بہت ہی اجمال کے ساتھ بتاتی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو خدمت اور حسنِ سلوک کے مستحق ہیں اور جن سے غفلت اور بے توجہی برتی نہیں جاسکتی۔ وہ آیت یہ ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ (النساء:۳۶)

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی (احسان کی روش اختیار کرو) رشتہ دار، پڑوسی اجنبی پڑوسی، ہم مجلس، مسافر اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو تمھارے قبضہ میں ہیں (حسن سلوک کرو) بے شک اللہ پسند نہیں کرتا اس شخص کو جو پندار میں مبتلا ہو اور شیخی بگھارتا ہو۔

اس آیت میں گو معاشرہ کے ان تمام کم زور اور محروم طبقات کا ذکر نہیں ہے، جن کی خدمت کی قرآن تاکید کرتا ہے، البتہ اس سے اس کے ہم دردانہ اور محبت بھرے رویہ کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔ یہاں ہم اس آیت کی مختصر سی تشریح کریں گے، لیکن اس سے پہلے یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ خدمت کے لیے قرآن مجید نے 'احسان' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ بڑی جامع اصطلاح ہے جو خدمت کے سب ہی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس میں دل جوئی، محبت، ضروریات کا پورا کرنا اور کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینا سب کچھ آجاتا ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

آیت میں اللہِ واحد کی عبادت کا حکم دینے کے بعد انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس ذیل میں سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (النساء:۳۶) والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

والدین کی خدمت کی تعلیم دنیا کے ہر مذہب نے دی ہے۔ قرآن مجید میں ایک دو نہیں بہت سے مقامات پر اللہ کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان پر سب سے زیادہ احسانات اللہ تعالیٰ

کے ہیں۔ اس کے بعد والدین کے احسانات ہیں۔ انسان کا وجود، اس کی پیدائش، پرورش، نگہداشت، تعلیم و تربیت اور اس کی معاشی و اخلاقی ترقی میں ماں باپ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ان کی توجہ نہ ہوتو وہ ترقی نہیں کرسکتا، بلکہ اس کا وجود ہی خطرہ میں پڑسکتا ہے۔ جاہل سے جاہل اور نادار ماں باپ بھی اولاد کے لیے جو قربانی دیتے ہیں انسانی معاشرہ میں اس کی کوئی اور مثال نہیں دی جاسکتی۔ ان کے احسانات میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ خدا کی عبادت دراصل اس کے احسانات کا شکر ہے۔ ماں باپ کا درجہ خدا کا نہیں اس لیے ان کی عبادت تو نہیں ہوسکتی، البتہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک ضروری ہے۔ یہی ان کے احسانات کا شکر ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بھی حکم دیا ہے اور والدین کا شکر ادا کرنے کی بھی ہدایت کی ہے۔ فرمایا:

اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ○ (لقمان:۱۴)

میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا بھی شکر بجالا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

موجودہ تہذیب نے خاندانی نظام کو درہم برہم کرکے رکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اعلیٰ اخلاقی قدریں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں جو اس نظام سے وابستہ تھیں۔ اس کا بڑا اثر بوڑھے ماں باپ پر پڑا ہے۔ آج باقاعدہ اس سوال پر غور ہورہا ہے کہ ساٹھ ستّر سال کے ان بوڑھوں کا کیا کیا جائے جو ہمارے لیے بےمصرف ہوچکے ہیں۔ جب وہ مستقبل کی تعمیر میں معاون نہیں ہیں تو ان کا بوجھ کب تک برداشت کیا جائے؟ حالاں کہ جن بوڑھوں کے بارے میں اس طرح سوچا جاتا ہے، انھوں نے موجودہ نسل کو اور اپنی اولاد کو اس وقت دریا برد نہیں کیا جب کہ وہ ان کے ہاتھوں میں مجبور و لاچار تھی اور ان کے رحم و کرم پر جی رہی تھی، بلکہ اسے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے پالا پوسا اور زندگی کے میدان میں دوڑ دھوپ کے قابل بنایا۔ قرآن نے خاص طور پر بڑھاپے میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ فرمایا:

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۝ (بنی اسرائیل:۲۳،۲۴)

اگر تمھارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تم انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو اور ان سے ادب اور احترام سے بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو کہ اے رب ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

ارشاد ہے:

وَ بِذِی الْقُرْبٰی اور قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

قرآن مجید نے والدین کے فوراً بعد قرابت داروں کا یہاں بھی ذکر کیا ہے اور دوسرے مقامات پر بھی۔اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کے بعد قرابت داروں کا حق سب سے زیادہ ہے۔ ماں باپ سے قرابت داروں کی قرابت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اصل تو وہ ہیں پھر جو شخص ان سے جتنا قریبی تعلق رکھتا ہے اس کا حق بھی اسی قدر بڑھ جاتا ہے۔ قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک صلۂ رحمی ہے۔ قرآن میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ایک جگہ اللہ والوں کی صفات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ۝ (الرعد:۲۱)

اللہ نے جن تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں وہ جوڑتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔

صلۂ رحمی سے پوری معاشرتی زندگی خوش گوار ہوتی ہے۔ جہاں یہ خوبی نہ ہو

ہاں معاشرت میں بگاڑ آجاتا ہے۔ اس وجہ سے صلۂ رحمی کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

سلیمان بن عامرؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

الصدقة على المسكين صدقة وهى علٰى ذى الرحم ثنتان صدقة وصلة[1]

کسی مسکین کو (جس سے رشتہ نہ ہو) صدقہ دینا محض ایک صدقہ ہے لیکن وہی صدقہ کسی رشتہ دار کو دیا جائے تو یہ صدقہ بھی ہے اور صلۂ رحمی بھی۔

مطلب یہ کہ رشتہ دار پر خرچ کرنا دہرے ثواب کا باعث ہے۔ ایک پہلو سے ، ایک عام صدقہ ہے، جس طرح دوسرے صدقات ہیں۔ دوسرے پہلو سے یہ رشتہ روں کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے اور صلۂ رحمی بھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان رشتہ داروں سے فطری طور پر قربت محسوس کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض رشتوں میں بڑی نزاکت پائی جاتی ہے۔ معمولی واقعات سے رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور تعلقات خراب ہونے لگتے ہیں۔ مدیث میں کہا گیا ہے کہ ان تعلقات کو بگڑنے نہ دیا جائے اور انھیں بحال رکھنے کی ممکنہ وشش کی جائے۔ حسن سلوک اس کی ایک بہترین صورت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لیسَ الواصلُ بالمُکافِی و لٰکنَّ الواصلَ الَّــذِی اذا انقطعت رحمھــا وصلھــا[2]

صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہے جو رشتہ داروں کے ساتھ اس وقت صلہ رحمی کرے جب کہ وہ بھی اس کے ساتھ سلوک کریں بلکہ حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو اس وقت تعلقات کو جوڑے جب کہ وہ ٹوٹ جائیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے:

---

[1] ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی الصدقۃ علی ذی القرابۃ۔ نسائی، کتاب الزکوٰۃ، باب صدقۃ علی الاقارب۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی۔ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم۔

ان رجلا قال یا رسول اللہ ان لی قرابۃ اصلھم و یقطعونی و احسن الیھم و یسیئون الی واحلم عنھم و یجھلون علی فقال لان کنت کما قلت فکانما تسفھم المل ولا یزال معک من اللہ ظھیر ما دمت علی ذالک[1]

ایک شخص نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ میں تو ان سے صلۂ رحمی کرتا ہوں، اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا معاملہ کرتے ہیں، میں ان سے درگزر کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا۔ اگر تمھارا سلوک ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے بیان کیا تو گویا تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھر رہے ہو اور جب تک تمھارا یہ رویہ رہے گا اللہ کی طرف سے ایک معاون تمھارے ساتھ رہے گا۔

منہ میں گرم راکھ ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے حسن سلوک سے ان کا ضمیر ان کو ملامت کرے گا اور انھیں اسی طرح تکلیف پہنچے گی جس طرح منہ میں گرم راکھ ڈالنے سے پہنچتی ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ تمھارے حسن سلوک سے خود ہی شرمندگی محسوس کریں گے، ان کے مقابلے میں اللہ کی مدد تمھیں حاصل رہے گی اور وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

یتیموں کے ساتھ حسن سلوک

والدین اور قرابت داروں کا حق سب پر مقدم ہے۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دینے کے بعد معاشرہ کے دوسرے ضرورت مند، محتاج اور کم زور افراد کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یتیموں اور مسکینوں کا ذکر کیا گیا ہے جو معاشرہ کے سب سے کم زور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ارشاد ہے:

وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ — اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا۔

جس معصوم بچے کے سر سے اس کے باپ کا سایہ اٹھ جائے وہ اس خلوص،
ت اور توجہ سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کی پرورش، تعلیم و تربیت اور بسا اوقات معاشی
ں اور استحکام کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے یہ معاشرہ کی ذمے داری ہے
، اس کی ضروریات پوری کرے اور اسے باپ سے محروم ہونے کا احساس نہ ہونے
ے۔ معاشرہ کی غفلت سے یہی نہیں کہ اس کی ٹھیک سے نشو و نما نہیں ہوگی اور وہ
مانی لحاظ سے کم زور ہوگا بلکہ اس کی صحیح ذہنی و فکری تربیت بھی نہیں ہو سکے گی۔ کوئی
ب نہیں کہ ایسے سنگ دل اور بے رحم معاشرہ کے خلاف اس کے اندر بغاوت کے
بات پرورش پانے لگیں اور وہ ایک اچھا شہری بننے کی جگہ پورے معاشرے کے لیے
مان دہ اور مضر ثابت ہو۔

قرآن و حدیث میں یتیموں کی پرورش، نگہداشت، تعلیم و تربیت، ان کے
ں و جایداد کی حفاظت اور ان کے حقوق کی ادائگی پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ حضرت
ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کافل الیتیم له او لغیره انا وهو کهاتین واشار مالک بالسبابة الوسطی[1]

یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا ہو یا کسی دوسرے کا (رشتہ دار ہو یا اجنبی) وہ اور میں جنت میں اس طرح قریب ہوں گے، جیسے میری یہ دو انگلیاں ہیں۔ اسے حدیث کے راوی مالک نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کرکے دکھایا۔

یتیم اپنی کم زوری اور ناسمجھی کی وجہ سے اپنے جائز حقوق کی بھی حفاظت نہیں
پاتا۔ اس کے حقوق پر قبضہ کرنا ہر کسی کے لیے آسان ہوتا ہے۔ قرآن نے ایسے
ں کو سخت وعید سنائی ہے۔ فرمایا:

---

[1] مسلم، کتاب الزہد، باب فضل الاحسان الی الارملۃ الخ

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًاؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۠ (النساء:۱۰)	بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال نا حق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

اسلام پورے معاشرہ پر یہ ذمے داری ڈالتا ہے کہ وہ یتیموں کی نہ صرف پرورش کا نظم کرے بلکہ انھیں خدا ترس، بااخلاق اور شریف انسان بننے میں مدد دے تاکہ معاشرہ پر بوجھ اور اس پر وبال بننے کی جگہ اس کے لیے سرمایہ بن سکیں۔

مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں کے ساتھ مسکینوں کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ مسکین سے مراد معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو جسمانی معذوری اور مالی دقتوں کی وجہ سے اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے عاجز ہوں۔ جسمانی معذوری بھی معاشی دوڑ دھوپ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور مالی دشواریاں بھی۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس رکاوٹ کو دور کیا جائے اور جو لوگ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے تاکہ ان کی ضروریات پوری ہوں اور ان کو معاشی استحکام حاصل ہو۔ قرآن و حدیث میں مسکینوں اور محتاجوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے اخلاقی اور قانونی حقوق کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ حکم ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِؗ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ (الروم:۳۸)	رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو (اس کا حق) یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

مسکین بالعموم گداگر اور بھیک مانگنے والے کو کہا جاتا ہے۔ بھیک مانگنا مجبوری اور بدحالی کی علامت نہیں ہے۔ جن لوگوں میں یہ مذموم عادت پیدا ہوجاتی ہے وہ بغیر

سی مجبوری کے بھی بھیک مانگتے ہیں۔ انھیں مسکین نہیں، مسکین صورت کہنا چاہیے۔ اس
ے برخلاف بعض لوگ سخت حاجت مند ہوتے ہیں، لیکن ان کی خود داری اور عزتِ نفس
ں بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔ قرآن کی
لیم یہ ہے کہ اس طرح کے حقیقی ضرورت مندوں کو دیکھا جائے۔ خاص طور پر ان
وں کو جو دین کی خدمت میں لگ جانے کی وجہ سے معاشی دوڑ دھوپ نہیں کرپاتے،
ن ان کا حال یہ ہے کہ ــــ

یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًاؕ (البقرة:۲۷۳)

ناواقف آدمی ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انھیں خوش حال سمجھتا ہے۔ آپ ان کے چہروں سے انھیں پہچان لیں گے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس آیت کی تشریح ملتی ہے۔
اتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یس المسکین الذین یطوف علی الناس ترده اللقمة اللقمتان والتمرة والتمرتان و لکن المسکین الذی لا یجد نی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه و لا یقوم فیسأل الناس[1]

مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان دستِ سوال دراز کیے گھومتا ہے۔ جسے دو ایک لقمے (یا کھانے کی کوئی چیز مثلاً) دو ایک چھوہارے لوٹا دیتے ہیں، بلکہ مسکین تو وہ ہے جو بنیادی ضروریات کے بھی پورا کرنے کا سامان نہ ہونے کے باوجود اس طرح رہتا ہے کہ اس کی حالت کا پتہ نہیں چلتا کہ اسے صدقہ یا خیرات دی جائے اور نہ وہ کھڑا ہوکر کسی سے سوال کرتا ہے۔

اس طرح سوسائٹی کے ان شریف اور معزز افراد کی مدد کی طرف توجہ دلائی گئی جن
معاشی پریشانیوں کا علم مشکل ہی سے ہوتا ہے اور جو سب سے زیادہ مدد کے مستحق
تے ہیں۔

---

[1] خاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ لایسئلون الناس الحافا۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب المسکین ں لایجد غنی الخ

پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

آیت میں پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت ان الفاظ میں دی گئی ہے:

وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (النساء:۳۶) رشتہ دار ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

انسان جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور جو اس کے ہم سایہ ہیں اور جن سے وہ اپنی سماجی اور معاشرتی زندگی میں الگ تھلک نہیں رہ سکتا ان کے حقوق ظاہر ہے ان لوگوں سے زیادہ ہیں، جن سے اس کا اس نوعیت کا تعلق نہیں ہوتا۔ یہاں پڑوسی اور ہم سایہ کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہ جو ہم سایہ ہونے کے ساتھ رشتہ دار بھی ہے، دوسرا وہ جس سے صرف ہم سایگی کا تعلق ہے۔ تیسرا وہ جس کا اتفاق سے یا کبھی کبھی ساتھ ہو جاتا ہے، جیسے سفر میں، دفتر اور آفس میں، اسکول اور کالج میں، کارخانہ اور فیکٹری میں، تجارت اور کاروبار میں، جن لوگوں کے ساتھ اس طرح کی رفاقت ہو وہ بھی ایک طرح کے 'ہم سایہ' ہیں۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت دنیا کے سب ہی مذاہب نے بیان کی ہے، لیکن اسلام نے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ ہم سایگی اور پڑوس کا اس قدر وسیع تصور دیا ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے کہا کہ انسان کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا تھوڑی بہت دیر کے لیے بھی ساتھ ہوجائے تو اس کا حق قائم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ رفاقت مستقل ہو تو اس کا حق بھی بہت بڑھ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

ما زال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ[۱]

حضرت جبریلؑ مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید فرماتے تھے کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ وراثت میں اس کا حصہ مقرر کردیں گے۔

---

[۱] بخاری، کتاب الادب، باب الوصایۃ بالجار۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار الخ

اسلام صرف یہی نہیں چاہتا کہ پڑوسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی معاشی، اخلاقی ہر طرح کی مدد کی جائے اور اس کے ساتھ انتہائی شریفانہ رویہ اختیار کیا جائے تاکہ سوسائٹی کا ہر فرد اس یقین اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرے کہ وہ خیر خواہ انسانوں کے درمیان جی رہا ہے، جن سے اسے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، وہ کسی بھی آڑے وقت میں اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے اور اس کے دکھ درد میں بھائیوں کی طرح کام آئیں گے۔ اس معاملے میں اسلام کی ہدایات کا اندازہ ذیل کی دو حدیثوں سے ہوسکتا ہے۔

حضرت ابوسعید خزاعیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے۔ دریافت کیا گیا کہ وہ کون شخص ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

الذین لا یامن جارہ بوائقہ[1] — وہ شخص جس کے ضرر اور ناگہانی مصائب سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔

اس حدیث میں پڑوسی کو ایذا پہنچانے اور تکلیف دینے کو ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اس کی حقیقی ضروریات سے بے توجہی کو خلافِ ایمان کہا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے:

لیس المؤمن الذی یشبع و جارہ جائع الی جنبہ[2] — وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے قریب بھوکا پڑا رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی پہچان ہی یہ ہے کہ آدمی کا پڑوسی اس کی وجہ سے سکون محسوس کرے اور وہ اس کے دکھ درد اور مشکلات میں کام آئے۔

---

[1] بخاری کتاب الادب، باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ و رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ بمعناہ، کتاب الایمان، الحث علی اکرام الجار

[2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب فی الشفقۃ علی الخلق بحوالہ بیہقی۔ الادب المفرد: ۲۰۱/۱۔ قال المنذری رواہ الطبرانی و ابو یعلیٰ و رواتہ ثقات و رواہ الحاکم من حدیث عائشۃ۔ الترغیب والترھیب: ۲۴۳/۳

مسافروں کے ساتھ حسن سلوک

اس کے بعد 'ابن السبیل' کا ذکر فرمایا۔ ابن السبیل مسافر کو کہا جاتا ہے۔ اجنبیوں اور مسافروں کی خدمت کو ہمیشہ ایک کارِثواب سمجھا گیا، ان کے لیے سرائیں تعمیر کی گئیں اور ان کے کھانے پانی اور آسائش و راحت کا انتظام کیا گیا۔ اب خدمت کا جذبہ ختم ہوگیا ہے اور ان سب چیزوں کی جگہ بڑے بڑے عالی شان ہوٹلوں نے لے لی ہے۔ ان ہوٹلوں سے ایک تو ہر شخص کے لیے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہے، دوسرے یہ کہ ان سے مسافر کے سارے مسائل حل نہیں ہوتے، جو شخص وطن سے دور اور حالتِ سفر میں ہو وہ بہت سی مشکلات سے دوچار ہوسکتا ہے۔ روپے پیسے کا نہ ہونا، صحت کا خراب ہو جانا، قیام و طعام کی مناسب سہولتوں کا نہ ہونا، کاروبار اور دوسری ضرورتوں کے لیے دوڑ دھوپ میں زحمتوں کا پیش آنا ایک عام بات ہے۔ اگر سفر دوسرے ملک کا ہو تو آدمی بین الاقوامی قوانین کے تحت بعض دوسری قسم کی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہوسکتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج کے دور میں مسافر کے مسائل پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ اسلام پورے معاشرہ کی یہ ذمے داری قرار دیتا ہے کہ وہ ایسے تمام مواقع پر مسافر کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے تاکہ وہ اجنبیت نہ محسوس کرے اور جس مقصد کے لیے اس نے گھر اور وطن چھوڑا تھا وہ سفر کی تکلیفوں کی وجہ سے پورا ہونے سے نہ رہ جائے۔

غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسن سلوک

جو لوگ خدمت اور حسن سلوک کے مستحق ہیں ان میں غلاموں اور محکوموں کو خاص طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء:۳۶) اور غلاموں سے حسنِ سلوک کرو۔

نزولِ قرآن سے بھی صدیوں پہلے سے غلامی کا رواج تھا۔ غلاموں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور ان کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ قرآن غلامی کو ختم

کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اس نے جو اقدامات کیے، یہاں ان سے بحث کا موقع نہیں ہے، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس سلسلے کا پہلا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ غلاموں اور محکوموں کے حقوق متعین کیے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔ اس ذیل کی بہت سی حدیثوں میں سے صرف ایک حدیث یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

هم اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فاطعموهم مما تأكلون والبسوهم مما تلبسون ولا تكلفوهم ما يغلبهم فان كلفتموهم فاعينوهم[1]	یہ غلام تمھارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو۔ اگر طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالو تو اس کے اٹھانے میں ان کی مدد کرو۔

حسنِ سلوک کے مستحق اِن نمایاں افراد اور طبقات کے ذکر کے بعد آخر میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالاً فَخُوْرًا۝ (النساء:۳۶)	بے شک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو مغرور ہے اور شیخی بگھارتا ہے۔

اس میں 'مختال' اور 'فخور' دو لفظ آئے ہیں۔ یہ دونوں لفظ گو ہم معنی ہیں، لیکن ان میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ مختال وہ ہے جس کے حرکت و عمل سے تکبر اور گھمنڈ کا اظہار ہو۔ فخور اس شخص کو کہا جاتا ہے، جو زبان سے شیخی بگھارتا اور بڑائی بیان کرتا پھرے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو وہ شخص سخت ناپسند ہے جس کے گفتار و کردار سے تکبر اور نخوت ٹپکتی ہو۔ تکبر انسان کو اللہ کی عبادت اور بندوں کی خدمت دونوں ہی سے باز رکھتا ہے۔ حالاں کہ ان دونوں ہی اوصاف کی وجہ سے انسان کی انسانیت قائم ہے ورنہ وہ جانور سے بھی بدتر مخلوق ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب العتق، باب قول النبیؐ العبید اخوانکم الخ۔ مسلم، کتاب الایمان، باب صحبۃ الممالیک۔

اخلاقی تعلیم کے ساتھ قانونی تحفظ

اس موقعے پر ایک خاص بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ کہ یہاں ماں باپ، خویش و اقارب، مسکینوں، محتاجوں اور معاشرہ کے دوسرے کم زور افراد اور طبقات سے اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ تعلیم مکہ سے لے کر مدینہ تک نزولِ قرآن کی پوری مدت میں مسلسل جاری رہی۔ اس طرح معاشرہ میں ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی، ہم دردی اور محبت کا مسلسل جذبہ پیدا کیا گیا اور کم زوروں، محروموں اور مستحقین کے حقوق پہچاننے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی پیہم ترغیب دی جاتی رہی۔ پھر ایک خاص مرحلہ میں اسلام نے ان سب کے حقوق متعین کیے اور انھیں قانونی تحفظ عطا کیا تاکہ کوئی شخص کسی کم زور پر دست درازی نہ کرسکے اور کوئی صاحبِ حق اپنے حق سے محروم نہ رہے۔[1]

---

[1] یتیموں، مسکینوں، محکوموں، ضعیفوں اور معذوروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی مزید تفصیل راقم کی کتاب 'اسلام۔ انسانی حقوق کا پاسبان' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خدمتِ خلق کے طریقے بہت ہیں

اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو معاشرے کے کم زوروں، ناداروں اورمحتاجوں کے ساتھ زبانی ہم دردی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ عملاً ہم دردی کرنے والے ذرا مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ معاشرہ کے جو افراد معاشی اور اقتصادی مشکلات میں گرفتار ہوں، انھیں زبانی ہم دردی سے زیادہ مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ لطف و محبت کے کلمات اور میٹھی باتوں سے وقتی طور پر انھیں تھوڑی سی قلبی راحت اور سکون چاہے مل جائے، لیکن ان کی مشکلات رفع نہیں ہو سکتیں۔

خدمت بذریعۂ مال

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو بار بار ہدایت کی ہے کہ وہ انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود میں جی جان سے اپنا مال صرف کریں اور اسے ضائع اور رائیگاں نہ سمجھیں، اس لیے کہ انسان کی جو دولت دوسروں کے کام آئے وہ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس سے کل قیامت کے روز وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ قرآن مجید عام طور پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ اور انفاق کا ذکر کرتا ہے، تاکہ اس کی اہمیت دل میں بیٹھ جائے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا کوئی شخص اس سے غافل نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرة:١١٠)

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور تم جو نیک عمل بھی اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے (یعنی اس کی بہترین جزا) اللہ کے پاس پاؤ گے۔ جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

سورۂ مزمل کے آخر میں ارشاد ہے:

... وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (المزمل:٢٠)

... اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھا قرض دو۔ تم جو نیک عمل بھی اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور زیادہ اجر والا پاؤ گے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

اہلِ ایمان کے مال میں محروموں کا حق ہے

قرآن مجید نے اہل ایمان کی جو تصویر کشی کی ہے اس میں ان کی یہ خوبی نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کا مال ان کے اور ان کے متعلقین ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ معاشرے کے ناداروں، کم زوروں، اور محروموں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ اس نے خدا ترس انسانوں کا ایک وصف یہ بیان کیا ہے:

وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۝ (الذاریت:١٩)

ان کے اموال میں حق ہے سائل اور محروم کا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (المعارج:٢٤،٢٥)

ان کے اموال میں متعین حق ہے سائل اور محروم کا۔

انسانوں کے مال میں دور و نزدیک کے جن افراد کا حق ہے اور جن پر اس کا

مال خرچ ہونا چاہیے، اس کی کسی قدر تفصیل سورۂ بقرہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ۝ (البقرۃ:۲۱۵)

وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں (اور کہاں خرچ کریں) انھیں بتا دیجیے کہ تم جو بھی مال خرچ کرو، اس کے حق دار والدین، رشتہ دار، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔ تم جو بھی بھلائی کرو گے اللہ اس سے واقف ہوگا۔

اس طرح اسلام نے حق داروں اور ضرورت مندوں پر مال خرچ کرنے کی تاکید بھی کی ہے اور اس کے اجر وثواب کو بیان کر کے اس کی ترغیب بھی دی ہے۔[1]

حسنِ سلوک

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کیا جاتا ہے تو عام حالات میں ذہن اسی مالی تعاون کی طرف منتقل ہوتا ہے، لیکن اسلام نے اس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے کہ کسی کی خدمت اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کے معنی یہی نہیں ہیں کہ اس کی مالی مدد کی جائے اور اس کی مادی ضرورتیں پوری کردی جائیں بلکہ اس میں محبت، ہم دردی، دل جوئی اور وہ اعلیٰ اخلاقی رویہ بھی داخل ہے جو ایک شریف انسان دوسرے انسان کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور جسے حسنِ سلوک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں اسی کا محتاج نہیں ہے کہ پیٹ بھرنے کے لیے اُسے دو وقت روٹی، تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور سر چھپانے کے لیے مکان مل جائے۔ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اُسے شفا خانے پہنچا دیا جائے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ غریب اور نادار ہے تو اُسے حقیر اور ذلیل نہ تصور کیا جائے، اس کے ساتھ مساوات اور برابری کا برتاؤ کیا جائے، وہ بیمار ہے تو اس کی دوا دارو ہی کا انتظام نہ ہو، بلکہ اس کی خدمت اور تیمار داری بھی کی

---

[1] اس پر مزید بحث مالی تعاون کے ذیل میں آرہی ہے ملاحظہ ہو۔ باب 'خدمت کے چند متعین پہلو'۔

جائے، اس میں کوئی خوبی ہے تو اس کا اعتراف کیا جائے، اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو عفو و درگزر سے کام لیا جائے، اس کی خوشی اور غم میں شرکت کی جائے اور ٹھوس مادی تعاون کے ساتھ گفتگو، میل جول اور تعلقات میں بھی اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے۔ قرآن مجید اور احادیث کی رو سے اس کے بغیر خدمت اور حسن سلوک کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ ماں باپ صرف اس کے محتاج نہیں ہوتے کہ اولاد ان کے کھانے کپڑے کا انتظام کردے، بلکہ وہ اولاد سے ایسی محبت اور ہم دردی کے بھی طالب ہوتے ہیں، جو ان کے بڑھاپے کی کلفتوں کو دور کردے۔ ان کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ وہ معاشرے میں اکیلے، تنہا اور بے مصرف ہوکر رہ گئے ہیں۔ ان کی ضعیفی اور پیرانہ سالی کی رعایت کرے۔ ان کو اپنا بڑا مانے اور ان کے ساتھ تعظیم و توقیر سے پیش آئے۔ اس کے لیے قرآن مجید نے والدین کے ساتھ 'احسان' کا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا○ (الاسراء:۲۳)

تمھارے رب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کروگے اور یہ کہ والدین کے ساتھ 'احسان' کا سلوک کروگے۔

سورۂ احقاف میں فرمایا:

وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ اِحۡسَانًا... (الاحقاف:۱۵)

ہم نے انسان کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ 'احسان' کا معاملہ کرے۔

یہ اور ان کی ہم معنی آیات میں اولاد کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ والدین کے ساتھ 'احسان' کی روش اختیار کریں۔ 'احسان' کے معنی کسی کو اس کے قانونی حق سے زیادہ دینے کے ہیں۔ اسی کو حسن سلوک کہا جاتا ہے۔

ایک جگہ فرمایا: ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ اگر وہ مشرک ہوں اور شرک پر تمھیں مجبور کریں تو تم ان کی اطاعت نہ کرو، اس لیے کہ

ـ کی کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تمھارا رویہ ان کے ساتھ 'معروف' کے
بق ہونا چاہیے۔

اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ شُرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ لَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا عْرُوْفًا...	اگر تمھارے ماں باپ تم پر سختی کریں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، جس کا تمھیں علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مانو (لیکن) دنیا میں معروف (لقمان:۱۵) کے مطابق ان کا ساتھ دو۔

قرآن مجید نے اولاد کو والدین کی معاشی کفالت کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان کے
ھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے، جس میں معاشی کفالت بدرجۂ اولیٰ اور سب سے پہلے
اتی ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے کہ آدمی کے والدین چاہے مسلمان
ں یا کافر، ان کا نان ونفقہ اس پر واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
ر والدین کے ساتھ بھی برتاؤ میں 'معروف' کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ (لقمان:۱۵) اس
تقاضا یہ ہے کہ ان کی مادی ضروریات لازماً پوری کی جائیں۔ لیس من المعروف ان
ش فی نعم اللہ تعالیٰ و یترکھما جوعاً یعنی یہ کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ
ی خود تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے چھوڑ دے[1]

بعض اوقات ہم دردی کا ایک لفظ، محبت بھری ایک بات اور ایک کلمۂ خیر کی مادی
دن سے زیادہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے شیریں کلامی اور حسن تخاطب کو
اہمیت دی ہے کہ ایک جگہ نماز اور زکوٰۃ سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے۔

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا لصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرۃ:۸۳)	اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

ایک غریب اور نادار شخص کی خدمت تو روپے پیسے کے ذریعے کی جاسکتی ہے،

---

[1] ہدایہ ج ۲، ص ۴۲۵، ۴۲۶۔ اس مسئلے پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب
ر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق'۔

لیکن جس کے پاس خود دولت ہو اسے ہمارے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ ہم دردی اور محبت اور اخلاقی رویے کا محتاج ہر شخص ہے۔ اس سے نہ کوئی امیر بے ہوسکتا ہے نہ کوئی فقیر۔

خدمت کے بعض اور طریقے

احادیث میں اس پہلو کو بہت نمایاں کیا گیا ہے کہ انسانوں کی خدمت ر پیسے ہی کے ذریعے نہیں ہوتی، بلکہ کسی معذور کی مدد کرنا، کسی اندھے کو راستہ دکھانا، ر سے کسی تکلیف دہ چیز کا دور کرنا، کسی کو پانی بھر کے دے دینا، حتیٰ کہ کسی سے پیشانی سے ملنا اور تہذیب وشرافت سے پیش آنا بھی ان کی خدمت ہے اور مالی مدد کی یہ بھی صدقہ ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

علی کل مسلم صدقة قالوا فان لم یجد قال فیعمل بیدیه فینفع نفسه و یتصدق قالوا فان لم یستطع او لم یفعل قال فیعین ذا الحاجة الملهوف قالوا فان لم یفعل قال فلیأمر بالخیر او قال بالمعروف قال فان لم یفعل قال فلیمسک عن الشر فانه له صدقة[1]

ہر مسلمان پر صدقہ کرنا واجب ہے۔ اس پر نے سوال کیا کہ اگر کسی کے پاس صدقہ کے کچھ نہ ہو تو کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا اپنے سے کوئی کام کرے، جو ملے اس سے خود بھی اٹھائے اور دوسروں پر بھی خرچ کرے۔ صحا عرض کیا کہ اس کی بھی طاقت نہ ہو تو جائے؟ آپؐ نے فرمایا کسی ضرورت مند مصیبت زدہ کی (مال کے علاوہ کسی اور ط سے) مدد کرے۔ عرض کیا گیا کہ اگر یہ ہوسکے تو کیا کیا جائے؟ ارشاد فرمایا کہ بھلائی دے یا یہ فرمایا کہ معروف کا حکم دے۔ عرض کہ اگر کوئی شخص یہ بھی نہ کرسکے تو اس کے ہدایت ہے؟ فرمایا وہ برائی سے رک جائے اس کے لیے صدقہ ہے۔

اس حدیث کے ذیل میں محدثین نے بعض باتوں کی وضاحت کی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقة۔ مسلم، کتاب الزکوة، باب بیان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف۔

مالی صدقات اہل ثروت کر سکتے ہیں لیکن صدقہ و خیرات مال کے ساتھ مخصوص
ہے، اس کی اور صورتیں بھی ہیں۔ ان صورتوں پر عام حالات میں بغیر زحمت کے
عمل کر سکتا ہے۔ حدیث میں اعمالِ خیر کی ترتیب نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ مثالوں
سئلے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ آدمی اعمالِ خیر
سے ایک پر عمل نہ کر سکے تو دوسرے پر عمل کر سکتا ہے، جو شخص ان سب پر عمل کر سکے
ضرور ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مال خرچ
نے کی جہاں ضرورت ہو وہاں مال خرچ کرنا ہی افضل ہے۔ اس کی جگہ جن اعمال کا
گیا ہے ان کا درجہ اس کے بعد ہے۔ حدیث میں شر سے بچنے کو بھی صدقہ کہا گیا
اگر آدمی دوسرے کے ساتھ برائی کرنے سے باز رہے تو یہ اس پر صدقہ ہے، اگر
کا تعلق خود اس کی اپنی ذات سے ہو تو یہ اس پر صدقہ ہے۔ حدیث کا خلاصہ یہ
مخلوق کے ساتھ شفقت اور ہم دردی کا رویہ ہونا چاہیے۔ یہ مال اور غیر مال دونوں
سے ممکن ہے۔ مال کے ذریعے مدد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے پاس
مال موجود ہو اور وہ خرچ کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے پاس مال نہ ہو اور وہ
سے کما کر خرچ کرے۔ مال کے علاوہ جو مدد ہوگی اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔
ی کی تکلیف دور کرے گا یا اسے تکلیف پہنچانے سے باز رہے گا۔ حدیث کے
بق یہ سب وہ صدقات ہیں جو ایک انسان دوسرے پر کرتا ہے۔[1]

مت صدقہ ہے

اس حدیث کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ خدمت کے تصور کے ساتھ عموماً
ی خدمات ذہن میں آتی ہیں۔ ان کو ادا کرنے کا یارا ہر شخص اپنے اندر نہیں پاتا
ٹی موٹی خدمات جنھیں انسان آسانی سے انجام دے سکتا ہے انھیں کوئی اہمیت نہیں
۔ اس طرح نہ بڑی خدمات انجام پاتی ہیں اور نہ چھوٹی۔ حدیث میں اس ذہن

جر، فتح الباری: ۳/ ۱۹۸

کی اصلاح کی گئی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں یہ حقیقت و
فرمائی ہے کہ نوعِ انسانی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جو خدمت بھی کی جا
ہے، کی جانی چاہیے۔ ہر خدمت صدقہ اور احسان ہے اور انسان اس پر اجر و ثوا
مستحق ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی بعض حدیثیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یعدل بین الاثنین صدقة و یعین الرجل علی دابته فیحمل علیها او یرفع علیها متاعه صدقة و الکلمة الطیبة صدقة و کل خطوة یخطوها الی الصلوٰة صدقة و یمیط الاذی عن الطریق صدقة[1]

کوئی شخص دو آدمیوں کے درمیان انص کردے یہ بھی صدقہ ہے، کسی کو جانور پر ہونے میں مدد دے یہ بھی صدقہ ہے، پر کسی کا سامان رکھ دے یہ بھی صدقہ زبان سے اچھی بات کرے یہ بھی صدقہ اسی طرح نماز کے لیے جو قدم اٹھائے و صدقہ ہے۔ راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کردے یہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی ایک روایت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ فرماتے ہ

قال رسول اللہ ﷺ تبسمک فی وجه اخیک لک صدقة و امرک بالمعروف و نھیک عن المنکر لک صدقة و ارشادک الرجل فی الارض الضلال لک صدقة و اماطتک الاذی والشوک والعظم عن الطریق لک صدقة وافراغک من دلوک فی دلو اخیک لک صدقة[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد تمھارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا صدقہ تمھارا معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع صدقہ ہے، تمھارا جنگل و بیابان میں راستہ کا پتہ نہ چلے، کسی کو راستہ دکھانا ہے، تمھارا راستہ سے گندگی، کانٹا اور (جیسی چیز) کا ہٹا دینا صدقہ ہے، تمھارا ڈول سے پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول ڈال دینا صدقہ ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب اخذ الرکاب ونحوہ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ان اسم الصدقۃ یقع
[2] ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

مطلب یہ کہ یہ تمام کام صدقات ہیں اور ان میں سے ہر کام کا تمھیں ثواب ملے گا۔ ان حدیثوں میں انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کی بہت سی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ خدمت کا جذبہ ہو تو بڑی آسانی سے ان پر عمل ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک روایت حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کل معروف صدقۃ[1] — بھلائی کا ہر کام صدقہ ہے۔

یہ ایک جامع حدیث ہے جو خدمتِ خلق کی سب ہی شکلوں پر حاوی ہے۔ بنی نوع انسان کی جس شکل میں بھی خدمت کی جائے وہ اس پر صدقہ و احسان ہے اور خدمت کرنے والا اس کے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔

صدقہ و خیرات کا کارِ خیر ہونا ہر شخص پر واضح ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کے ہر کام کو صدقہ قرار دے کر اس کی عظمت دلوں میں بٹھا دی گئی ہے۔ مزید ہدایت یہ کی گئی ہے کہ بھلائی کے کسی چھوٹے سے عمل کو بھی حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ خلقِ خدا کو جو فائدہ بھی پہنچایا جاسکتا ہے اس سے ہاتھ روک لینا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تحقرن من المعروف شیئا و لو ان تلق اخاک بوجه طلیق[2] — بھلائی کے کسی کام کو حقیر ہرگز نہ سمجھو اگرچہ وہ اپنے بھائی سے مسکرا کر تمھارا ملنا ہی کیوں نہ ہو۔

انسانوں کی خدمت جس پہلو سے اور جتنی کچھ بھی ہوسکتی ہے ضرور کی جانی چاہیے۔ یہ عذاب جہنم سے نجات کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے جہنم کی ہولناکی کا ذکر کیا، اس سے پناہ مانگی اور ارشاد فرمایا:

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقۃ و رواہ مسلم عن حذیفہؓ، کتاب الزکوٰۃ، باب ان اسم الصدقۃ یقع الخ [2] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب استحباب طلاقۃ الوجہ عند اللقاء

جہنم سے بچو، اگر کچھ نہ ہو تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا صدقہ کر کے ہی سہی۔ یہ بھی نہ ہو تو زبان سے اچھی بات کر کے ہی اس سے بچو۔	اتقوا النار ولو بشق تمرة فان لم یکن فبکلمة طیبة[1]

جب کسی مستحق کی مدد کی جاتی ہے تو وہ ایک طرح کی فرحت اور راحت محسوس کرتا ہے، اسی طرح خوش کلامی بھی مسرت اور خوشی کا باعث ہوتی ہے اس لیے دونوں ہی صدقہ کی صورتیں ہیں۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی خدمت اور ان کے ساتھ خیر خواہی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص اس محاذ پر اپنا حق ادا کرسکتا ہے اور اسے فی الواقع ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے نہ تو صاحبِ ثروت ہونا ضروری ہے اور نہ حکومت و ریاست کے تعاون ہی کی حاجت ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دولت و ثروت یا حکومت و ریاست کے ذریعے صرف چند گوشوں میں انسانوں کی خدمت ہوسکتی ہے۔ بہت سے گوشے وہ ہیں جہاں فرد کا اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار ہی کام آسکتا ہے۔ حکومت و ریاست کسی معذور کو وظیفہ، کسی بے روز گار کو روز گار، کسی بے گھر کو مکان اور کسی مریض کو طبی امداد تو فراہم کرسکتی ہے لیکن اپنے تمام وسائل کے باوجود ماں، باپ، بیوی، بیٹے، بھائی، دوست ہم سایہ اور شریف شہری کا بدل نہیں بن سکتی۔ جو جذباتی سکون اور اعلیٰ سلوک اس کو ان افراد سے مل سکتا ہے وہ ریاست کے کسی چھوٹے بڑے ادارہ سے نہیں مل سکتا۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب طیب الکلام۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق تمرۃ۔ الخ

[2] ابن حجر، فتح الباری: ۱۰/۳۴۵

وقتی خدمت کی اہمیت اور فضیلت

بندگانِ خدا کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت یہ ہے کہ ن کی وقتی اور ہنگامی ضروریات پوری کی جائیں۔ بعض اوقات انسان وقتی اور ہنگامی مدد کا نخت محتاج ہوتا ہے۔ اس میں تھوڑی سی غفلت بھی اسے شدید نقصان پہنچا سکتی ہے۔ کبھی ،د کرنے والا بھی وقتی طور پر ہی کچھ مدد کرنے کے قابل ہوتا ہے اس سے زیادہ کی اس کے اندر وسعت اور گنجائش نہیں ہوتی۔ اسلام نے اس نزاکت کو محسوس کیا ہے۔ اس نے یک طرف ترغیب دی ہے کہ خدا کے جس بندہ کو جس وقت جس قسم کی مدد کی ضرورت د وہ فراہم کی جائے، دوسری طرف تاکید کی ہے کہ آدمی کسی ضرورت مند کی وقتی طور پر ھوڑی بہت جو کچھ بھی مدد کرسکتا ہو اس سے دریغ نہ کرے۔

یہاں وقتی اور ہنگامی تعاون کی بعض صورتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

کھانا کھلانا

وقتی مدد کی ایک شکل بھوکے کو کھانا کھلانا ہے۔ جو شخص بھوک سے تڑپ رہا ہو، ں کا حق ہے کہ اس کی بھوک فوراً مٹائی جائے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے نیک ندوں کی، جو جنت کی ابدی نعمتوں کے حق دار ہوں گے۔ تعریف کرتے ہوئے ایک بلکہ فرمایا ہے:

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ — وہ کھانے کی خواہش اور ضرورت کے باوجود

مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لاَ نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلاَ شُكُوْرًا○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْماً عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا○ (الدھر:۸-۱۰)

اسے مسکین یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں او (کہتے ہیں) کہ ہم تو صرف اللہ کی خوش نودی کے لیے تمھیں کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کا ڈر لگا ہوا ہے، جو بہت سخت او غصہ سے بھرا ہوا ہوگا۔

کسی بھوکے کو کھانا کھلانے کی فضیلت میں بہت سی احادیث مروی ہیں یہاں صرف دو ایک حدیثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا:

ایُّ الاسلام خیر ؟ — بہترین اسلام کیا ہے؟

یہاں سوال غالبًا اسلام کی ان نمایاں خصوصیات کے بارے میں تھا، جن تعلق انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود سے ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

تطعم الطعام و تقرئ السلام علی من عرفت و من لم تعرف[1]

یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور جاننے اور نہ جاننے والوں دونوں ہی کو سلام کرو۔

حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو میں حاضر ہوا۔ جوں ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی میں سمجھ گیا کہ یہ کسی جھوٹے انسان چہرہ نہیں ہے۔ پہلی بات جو آپؐ نے اس وقت فرمائی وہ یہ تھی۔

یا ایھا الناس افشوا السلام و اطعموا الطعام وصلوا الارحام و صلّوا باللّیل والناس نیام تدخلوا

اے لوگو! سلام کو رواج دو اور اسے پھیلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، رشتوں کو جوڑو، رات میں جب کہ لوگ سو رہے ہوں نماز پڑھو، امن و سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام۔ مسلم، کتاب الایمان، باب تفاضل الاسلام و ای اموره افضل۔

الجنة بسلام[1] ہو جاؤ گے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانا بہ ظاہر ایک چھوٹی سی خدمت ہے، لیکن کسی معاشرہ میں اس کی اہمیت کا احساس پیدا ہو جائے تو کوئی بھی شخص بھوک پیاس برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوگا، بلکہ ایسا معاشرہ فقر و فاقہ کا بہت آسانی سے اور بہت جلد علاج ڈھونڈ نکالے گا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ کے ابتدائی دور میں جب کہ اسلامی ریاست کی معیشت بہت زیادہ مستحکم نہیں تھی، بھوک اور افلاس کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اور طریقوں کے ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار فرمایا تھا۔ چناں چہ بھوکوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

طعام الاثنین کافی الثلاثة و طعام الثلاثة کافی الاربعة[2]	دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی ہے اور تین آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کفایت کرتا ہے۔

یہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں اس سے آگے کی بات کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

طعام الواحد یکفی الاثنین و طعام الاثنین یکفی الاربعة و طعام الاربعة یکفي الثمانية[3]	ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے کافی ہے اور دو آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کافی ہے اور (اسی طرح) چار آدمیوں کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

ان طعام الواحد یکفی الاثنین و	ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کفایت

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل الصدقۃ، بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ، دارمی۔ اس سلسلے کی مزید احادیث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون 'کم زور—اسلام کے سایے میں' مطبوعہ ماہ نامہ زندگی، رام پور، اگست، ستمبر ۱۹۷۸ء

[2] بخاری، کتاب الاطعمہ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین۔ مسلم کتاب الاشربہ، باب فضیلۃ المواساۃ فی الطعام الخ

[3] مسلم حوالہ سابق۔ ابن ماجہ، ابواب الاطعمہ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین

ان طعـام الاثنین یکفـی الثلاثـة والاربعة و ان طعام الاربعة یکفی الخمسة و الستة[1]

کرتا ہے اور دو آدمی کا کھانا تین اور چار کے لیے کافی ہے اور چار آدمیوں کا کھانا تو پانچ اور چھ کے لیے کافی ہے۔

ان روایات میں بہ ظاہر دو مختلف باتیں کہی گئی ہیں، لیکن ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پہلی حدیث میں کہا یہ گیا ہے کہ جو کھانا دو آدمی سیر ہو کر کھا سکتے ہیں، اس سے تین آدمیوں کی ضرورت بہ آسانی پوری ہو سکتی ہے۔ بعد کی دو حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کفایت کر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس سے دونوں کو قوتِ حیات فراہم ہو سکتی ہے اور دونوں زندہ رہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ان سب باتوں کا تعلق اشخاص اور حالات سے ہے۔ ان احادیث میں اصلاً جس بات کی ترغیب دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کھانے میں دوسرے بھوکے انسانوں کو شریک کرے اور یہ یقین رکھے کہ جو کچھ موجود ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا اور سب کی ضرورت پوری ہوگی۔

مسکینوں کی مدد کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کا جذبہ رسول اللہ ﷺ جس طرح پیدا فرما رہے تھے، اس کا اندازہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ بکری ذبح ہوئی اور تقسیم ہوگئی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کچھ گوشت بچا بھی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ سوائے ایک شانے کے کچھ نہیں بچا ہے۔ سب خیرات کر دیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا نہیں! سب کچھ باقی ہے سوائے ایک شانہ کے[2] مطلب یہ کہ جو صدقہ کر دیا گیا اس کا اجر و ثواب تو محفوظ ہوگیا، اس کے بارے میں یہ کیوں سمجھا جائے کہ وہ ختم ہوگیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں قربانی کا گوشت خشک کر کے کافی دنوں تک استعمال کرنے کا رواج تھا۔ قحط کے زمانے میں آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ تین دن

---

[1] ابن ماجہ، ابواب الاطعمۃ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین

[2] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ ۲/۷۰۔ مسند احمد: ۶/۵۰

سے زیادہ گوشت نہ رکھا جائے۔ اس کی وجہ حضرت عائشہؓ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

اراد ان یطعم الغنی الفقیر[1]	آپؐ یہ چاہ رہے تھے کہ جو صاحب حیثیت ہیں وہ فقراء کو (یہ گوشت) کھلائیں۔

مسکینوں کو کھانا کھلانا بعض صحابہ کرامؓ کا ایک محبوب عمل تھا، اس سے انھیں کتنی دلچسپی تھی اور اس کا وہ کس قدر اہتمام فرماتے تھے اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے ہوسکتا ہے۔

حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کسی مسکین کو کھانے میں شریک کیے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے[2]

حضرت صہیبؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ غریبوں کو کھانا بہت کھلایا کرتے تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے گرفت کی تو انھوں نے فرمایا:

ان رسول اللہ ﷺ کان یقول خیارکم من اطعم الطعام و رد السلام فذالک الذی یحملنی علی ان اطعم الطعام[3]	رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو غریبوں کو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے۔ آپؐ کی یہی بات مجھے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔

اس سلسلے کا ایک بہت ہی موثر واقعہ ہمیں حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے، جس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ فقر و فاقے اور مصیبت میں گرفتار ہوں۔ آپؐ نے ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک کے گھر سے اسے کھلانے کے لیے کچھ منگوایا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس وقت سوائے پانی کے کچھ نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے دوسری زوجہ مطہرہؓ کے گھر

---

[1] بخاری، کتاب الاطعمہ، باب ما کان السلف یدخرون فی بیوتھم و اسفارھم

[2] بخاری، کتاب الاطعمہ، باب المومن یاکل فی معی واحد

[3] مسند احمد: ۱۶/۶

بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ اسی طرح باری باری سب ہی ازواج کے ہاں سے یہی اطلاع ملی کہ اس وقت کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔آپؐ نے حاضرین سے فرمایا کہ کون اسے کھانا کھلائے گا۔ اللہ اس پر رحم فرمائے۔ یہ سن کر ایک انصاری نے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ حضرت ابوطلحہؓ تھے ـــــ فرمایا کہ میں یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ چناں چہ وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بیوی سے پوچھا کہ تمھارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ صرف بچوں کا کھانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر سلا دو۔ جب دسترخوان لگ جائے تو چراغ کو ٹھیک کرنے کے بہانے اسے بجھا دو اور اس طرح ظاہر کرو جیسے ہم بھی کھا رہے ہیں۔ چناں چہ بیوی نے اس پر عمل کیا اور چراغ بجھا دیا۔ اندھیرے میں میاں بیوی دونوں ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کھانے میں شریک ہیں۔ چناں چہ مہمان نے تو کھانا کھالیا اور یہ دونوں رات بھر بھوکے رہے۔ صبح رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تم دونوں کے رات کے عمل سے بہت خوش ہوا ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی یہ آیت ایسے ہی موقعے کے لیے ہے)۔

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۛ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ (الحشر:۹)[1]

وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

کھانا کھلانے میں تعاون

کسی غریب کو کھانا کھلانے میں بیوی اور خادم کی طرف سے جو تعاون ملتا ہے اس کا انھیں اجر ملے گا۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] بخاری، کتاب فضائل اصحاب رسول اللہؐ، باب قول اللہ عزوجل و یوثرون علیٰ انفسھم الخ۔
مسلم، کتاب الاشربہ، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ۔

اذا اطعمت المرأۃ من بیت زوجھا غیر مفسدۃ فلھا اجرھا ولہ مثلہ وللخازن مثل ذالک[1]	جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے، نقصان پہنچائے بغیر کھانا کھلاتی ہے تو اسے اس کا اجر ملے گا۔ اسی کے مثل شوہر کو اجر ملے گا اور خازن کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا۔

خازن کے سلسلے میں ایک اور حدیث اسی مفہوم کی آتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ شعریؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

الخازن المسلم الذی ینفذ و ربما قال یعطی ما امر بہ کاملا موفرا طیبۃ نفسہ فیدفعہ الی الذی امر بہ احد المتصدقین[2]	جو مسلمان خازن اس حکم کو نافذ کرتا ہے جو اسے دیا گیا ہے۔ بسا اوقات آپ نے یوں فرمایا کہ جس چیز کے دینے کا اسے حکم دیا گیا ہے وہ دیتا ہے۔ پورا پورا دیتا ہے اور خوش دلی سے دیتا ہے، جس شخص کے حوالے کرنے کے لیے اسے کہا گیا ہے اس کے حوالے کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔

آدمی کی بیوی ہو یا خادم یا اس کا گماشتہ اور امین، اس کی اجازت ہی سے اس کا ال خرچ کرسکتے ہیں۔ اجازت کے بغیر انھیں اس کے مال کے تصرف کا حق نہ ہوگا، یکن اجازت صراحت کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے اور عرف اور رواج کے تحت بھی۔ اگر یہ ات متعارف ہو کہ ایک خاص حد کے اندر غریبوں کی مدد کرنے یا انھیں کھلانے پلانے یں شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو بیوی اس حد تک عمل کرسکتی ہے۔ اگر اعتراض کا ندیشہ ہو تو اسے احتیاط کرنی چاہیے۔

یہ تو ایک قانونی بات ہے۔ ورنہ آدمی کو اتنا فراخ دل ہونا ہی چاہیے کہ بیوی یا وہ خادم جس پر اسے اعتماد ہو، اگر اس کے مال سے کسی مسکین کی مدد کردے تو وہ فرحت

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر المرأۃ اذا تصدقت و اطعمت الخ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر الخازن الامین والمرأۃ

[2] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر الخازن الخ

اور خوشی محسوس کرے کہ ایک کارِ خیر میں انھوں نے اس کی مدد کی۔ اس سے وہ خود بھی اجروثواب کا مستحق ہوگا۔

ایک صحابی جن کا لقب 'ابی اللحم تھا' کہتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے حکم سے گوشت کے پارچے بنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک مسکین آیا تو میں نے اسے کچھ گوشت دے دیا۔ میرے مالک کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے مار دیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے انھیں بلاکر مارنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے عرض کیا کہ اس نے میری اجازت کے بغیر میری چیز دوسروں کو دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا الاجر بینکما یعنی اجر تم دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔[۱] یعنی تم دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اجر ملے گا۔ غلام نے یہ سمجھ کر صدقہ کیا تھا کہ مالک کو اس پر اعتراض نہ ہوگا اس لیے وہ اجر پائے گا۔ مالک کا مال خرچ ہوا اس لیے وہ اجر کا مستحق ہوگا۔

پانی پلانا

پانی انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نعمت چوں کہ بڑی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے، اس لیے اس کی قدر و قیمت محسوس نہیں کی جاتی۔ جس شخص کے حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے ہوں اس کے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ بر وقت اسے دو گھونٹ پانی مل جائے۔ اسلام کے نزدیک جس طرح بھوکے کو کھانا کھلانا باعثِ ثواب ہے، اسی طرح پیاسے کو پانی پلانا بھی ثواب کا باعث ہے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔

ایّما مسلم سقی مسلما علی ظمأ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم[۲]

جو مسلمان کسی مسلمان کو اس کی پیاس کے وقت پلائے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے وہاں کی مہر بند شراب پلائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ایک شخص بیابان میں چلا

۱۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر الخازن الخ

۲۔ ابوداود، کتاب الزکوۃ، باب فی فضل سقی الماء۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب... ۲/ ۲۸

بِا رہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی۔ اسی حالت میں اس نے ایک کنواں دیکھا تو اتر کر پانی
یا۔ جب خوب سیراب ہوکر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ وہ فوراً
کنویں میں اترا اور اپنے موزے میں پانی بھر کر لایا اور اس بے زبان جانور کو پلایا۔ اللہ
تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اسے معاف فرما دیا۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے
دریافت فرمایا۔ کیا جانوروں کی خدمت میں بھی ثواب ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

فی کل کبد رطبة اجر[1]	ہر تر و تازہ جگر (زندہ مخلوق) کی خدمت میں اجر وثواب ہے۔

ایک روایت میں اسے بنو اسرائیل کی ایک زانیہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بتایا
گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کی مغفرت فرما دی۔[2]

ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ نے بعض اہم امور خیر کی ہدایت فرمائی۔ اس کے
بعد ارشاد فرمایا:

فان لم تطق ذٰلک فاطعم الجائع واسق الظمـــــآن[3]	اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔

کھانے کی تیاری میں جزوی مدد کرنا

کھانے کے تیار کرنے میں آٹا، چاول، دال، گوشت، سبزی، نمک، پانی اور
ایندھن وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خدمت کی ایک شکل یہ ہے کہ بعض غذائی اشیاء
کے ذریعے مدد کی جائے یا ایندھن فراہم کیا جائے۔ اس کی بھی فضیلت آئی ہے۔ ان
میں سے بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان سے منع کرنا ہی نہیں
چاہیے۔ وہ انسان ہی کیا جو کسی کی نمک اور پانی کی ضرورت بھی پوری نہ کرے۔ حضرت

---

[1] بخاری، کتاب المساقات، باب فضل سقی الماء۔ مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب فضل سقی البہائم الخ
[2] مسلم حوالہ سابق
[3] مسند احمد: ۴/ ۲۹۹۔ قال المنذری رواہ احمد، و ابن حبان فی صحیحہ و البیہقی وغیرہ۔ الترغیب والترھیب: ۳/۲۱

عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا اے اللہ کے رسولؐ! وہ کیا چیز ہے، جس سے منع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ پانی، نمک اور آگ۔ میں نے عرض کیا کہ پانی کی اہمیت سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن نمک اور آگ کی کیا اہمیت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اے حمیراء (حضرت عائشہؓ کا لقب) جس نے کسی کو آگ فراہم کی، گویا اس نے اس پورے کھانے کا صدقہ کیا جو اس آگ سے تیار ہوا ہے، جس نے نمک دیا اس نے گویا اس پورے کھانے کا صدقہ کیا جو اس نمک کی وجہ سے لذیذ اور مزے دار ہوا ہے۔ جس نے کسی مسلمان کو کسی ایسی جگہ پانی پلایا جہاں کہ پانی دست یاب ہی نہیں تھا تو گویا اس نے اسے زندہ کیا۔[1]

لباس فراہم کرنا

انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا کے بعد لباس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس کی دیگر ضروریات کی طرح اس ضرورت کو بھی مستقل طور پر حل ہونا چاہیے۔ اس کے وقتی اور عارضی حل کی بھی اہمیت ہے۔ اسلام نے اسے کارِ ثواب قرار دیا ہے۔ کسی برہنہ تن انسان کو کپڑا فراہم کرنے کا ثواب کئی ایک حدیثوں میں بیان ہوا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

ما من مسلم کسیٰ مسلمًا ثوبا الا کان فی حفظ من الله ما دام علیه منه خرقة[2] — جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے، وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتا ہے جب تک کہ اس پر اس کا ایک ٹکڑا بھی ہے۔

اگر آدمی کسی شخص کو اپنا بدن ڈھکنے کے لیے نیا کپڑا نہ دے سکے تو استعمال شدہ

---

[1] ابن ماجہ، ابواب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔ اس کے ایک راوی علی بن زید بن جدعان کو بالعموم محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن امام ترمذی نے اسے صدوق (سچا) کہا ہے۔ اس کی بعض روایات کو حسن اور ایک روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

[2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل الصدقۃ بحوالہ احمد، ترمذی۔

را ہی اسے پہنا دے۔ یہ بھی اجر کا باعث ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ میں نے
ں اللہؐ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو شخص نیا کپڑا زیب تن کرے اور یہ دعا پڑھے:

حمد للّٰہ الذی کسانی ما	شکر ہے خدا کا جس نے مجھے لباس پہنایا،
اری بہ عورتی و اتجمل بہ	جس سے میں ستر پوشی کرتا اور اپنی زندگی میں
ی حیوتی۔	زیب و زینت کا کام لیتا ہوں۔

اس طرح اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد جب یہ کپڑا پرانا ہو جائے تو صدقہ
دے، اس سے وہ اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں
ہے گا۔[1]

ئل کا حق پہچاننا

وقتی اور ہنگامی مدد کا محتاج وہی شخص نہیں ہوتا جو مفلس اور نادار ہو، بلکہ اس کی
رت خوش حال انسان کو بھی پیش آسکتی ہے۔ اس کا تعلق مالی حیثیت سے زیادہ ان
ت سے ہے، جن میں وہ ہنگامی طور پر گھر گیا ہے۔ راستے میں کسی کی جیب کٹ
ئے اور اس کا اپنے گھر پہنچنا مشکل ہوجائے تو آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ اس کی مدد
یں۔ دولت مند سے دولت مند انسان بھی کسی وقت مجبور و بے بس ہو جاتا ہے۔
صورت میں اس کا حق ہے کہ اس کی حاجت پوری کی جائے۔ یہی حقیقت ایک
یث میں اس طرح بیان ہوئی ہے، جس کی روایت امام حسینؓ نے رسول اللہ ﷺ سے
ہے۔

سائل حق و ان جاء علی فرس[2]	سوال کرنے والا گھوڑے پر سوار ہوکر آئے تو بھی اس کا (تم پر) حق ہے۔

---

[1] زمذی، دعوات، احادیث شتیٰ من ابواب الدعوات۔ ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب ما یقول
ل اذا لبس ثوباً جدیدا۔
[2] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب حق السائل۔

امام خطابی فرماتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سائل کے ساتھ حسنِ
رکھا جائے اور فوراً اس کی تکذیب نہ کردی جائے اس لیے کہ بہ ظاہر وہ کتنی ہی بہتر حا
میں کیوں نہ ہو اور سواری کے لیے اپنے پاس گھوڑا ہی کیوں نہ رکھتا ہو، اس کا امر
بہرحال ہے کہ وہ کسی ناگہانی مصیبت یا قرض میں گرفتار ہو۔ ظاہر ہے ان صورتوں
صدقہ لینا اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔ کچھ اور اسباب بیان کرنے کے بعد فرما
ہیں کہ مختلف اسباب ایسے ہو سکتے ہیں، جن میں سائل کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اسے
دینا صحیح نہیں ہے۔[1]

حدیث میں ایک طرف تو سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے اور پیشہ ور سائ
کی مذمت کی گئی ہے، دوسری طرف یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ضرور
کے تحت دست سوال دراز کرے تو اس کی ضرورت، جس حد تک امکان میں ہو پ
کردی جائے۔

ام بجیدؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ حضور! کبھی کوئی مح
میرے دروازہ پر پہنچ جاتا ہے اور میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو
ندامت محسوس ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو جلا
کُھر ہی اسے دے دو۔[2]

سائل کے ساتھ جو برتاؤ ہونا چاہیے، اس کی ایک اعلیٰ مثال ذیل کے وا
میں ملتی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ آج کسی نے کسی مسکین
کھانا کھلایا ہے؟ حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں مسجد گیا تو دیکھا کہ ا
شخص سوال کر رہا ہے، میرا لڑکا عبد الرحمٰنؓ وہیں روٹی کا ایک ٹکڑا کھا رہا تھا میں نے وہ
اس کے ہاتھ سے لے کر سائل کو دے دیا۔[3]

---

[1] خطابی، معالم السنن: ۲/۷۶

[2] ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی حق السائل۔ ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب حق السائل۔

[3] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب المسألہ فی المسجد۔

یض کی عیادت اور خدمت کرنا

ہنگامی مدد کی اس شخص کو بھی ضرورت پیش آتی ہے، جس پر اچانک کسی مرض کا
ید حملہ ہو جائے یا کسی حادثہ سے دوچار ہو جائے۔ اس میں تاخیر سے اس کی تکلیف
سکتی ہے اور بعض اوقات اس کی زندگی ہی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ صحیح احادیث میں
مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے
وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے اور دوسرا یہ کہ مرنے پر اس کے جنازے اور
ن میں شرکت کی جائے۔[1]

مریض کی عیادت یا خدمت بعض اوقات ایک قانونی حق کی صورت اختیار
یتی ہے۔ جو شخص بر وقت اس حق کو ادا کرے وہ شریعت کے نزدیک بڑے
ثواب کا مستحق ہے۔[2]

ناری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز۔ مسلم، کتاب السلام، باب من حق المسلم علی
رد السلام۔

عیادت سے متعلق مزید احادیث اور ان کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب
ت و مرض اور اسلامی تعلیمات' باب عیادت کی شرعی اہمیت۔

مشکلات کے پائے دار حل کی ضرورت

کتنی اچھی بات ہے اور کس قدر ثواب کا کام ہے اگر کوئی شخص دستِ سوال دراز کرے تو دو چار پیسوں سے اس کی مدد کر دی جائے، کسی فاقہ زدہ کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا جائے اور جو برہنہ تن ہے اُسے تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا فراہم کر دیا جائے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ، جن کو اللہ نے توفیق دی ہے، اس پر عمل کرتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں، لیکن کیا خدمتِ خلق بس یہی ہے۔ کیا اس سے اس کا پورا حق ادا ہو جاتا ہے؟ آیئے اسی سوال پر ذرا تفصیل سے غور کیا جائے۔

یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ کسی ضرورت مند کی وقتی طور پر کوئی چھوٹی بڑی مدد کر دی جائے، لیکن ضرورت وقتی نہیں ہے تو فطری طور پر اس کی مدد بھی اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک کہ ضرورت باقی ہے۔ جس شخص کی مشکلات زیادہ بڑے تعاون کا مطالبہ کرتی ہوں یا جہاں طویل مدت تک تعاون کی ضرورت ہو وہاں ضروری ہے کہ اسی نوعیت کا تعاون بھی کیا جائے۔ جو شخص نوع بنوع پیچیدہ مشکلات میں مبتلا ہو، اس کے مسائل اسی وقت حل ہوں گے جب کہ اسے ان مشکلات سے نکلنے کے لیے ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں، اس کے مسائل کا عارضی نہیں مستقل حل ڈھونڈا جائے اور جن اسباب کی وجہ سے زندگی کی جدوجہد میں وہ پیچھے رہ گیا ہے ان کو دور کیا جائے، اس کی غربت کا علاج کیا جائے، اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ بھوکا ننگا نہ رہے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہر وقت اسے کسی کا دست نگر اور محتاج نہ ہونا پڑے۔

اگر یہ حقیقت پیش نظر ہو تو خدمت خلق کے بارے میں ہمارا تصور بدل سکتا ہے اور ہم اس کے وسیع تقاضوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اسے ہم بعض مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسکینوں اور بیواؤں کی خدمت کا وسیع تصور

کسی فقیر اور مسکین کو ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی کارِ ثواب ہے۔ اس کی فضیلت قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن ایک مسکین جب تک مسکین ہے، اس کا حق باقی رہے گا اور فرد کی بھی اور ریاست کی بھی ذمے داری ہوگی کہ اسے اس حالت سے نکالے اور اس کے فقر و احتیاج کو مستقل طور پر ختم کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ معاشرہ میں باوقار اور اطمینان کی زندگی گزار سکے۔ اس کی فضیلت ایک حدیث میں جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں، ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الساعی علی الارملة والمسکین کا لمجاھد فی سبیل اللہ او القائم اللّیل الصائم النھار[1]

بیواؤں اور مسکینوں کے لیے سعی و جہد کرنے والا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا رات میں قیام کرنے والے، دن میں روزہ رکھنے والے کے مانند ہے۔

بیواؤں اور مسکینوں کے لیے دوڑ دھوپ میں وہ ساری کوششیں شامل ہیں جو ان کی فلاح و بہبود کے لیے کی جائیں، ان میں ان کی ضروریات کی تکمیل، ان کے لیے روزگار فراہم کرنا اور ان کو سماج میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل بنانا سب کچھ آجاتا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

المراد بالساعی الکاسب لھما العامل لمؤنتھا[2]

سعی وجہد کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو ان کی معاش کے لیے دوڑ دھوپ اور ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے محنت مشقت کرے۔

---

[1] بخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقة علی الاہل، مسلم: کتاب الزہد [2] شرح مسلم: ۴۱۱/۲

اس کی شرح حافظ ابن حجر نے ان الفاظ میں کی ہے:

الذی یذھب و یجئ فی تحصیل ما ینفع الارملة والمسکین[1]

اس سے مراد وہ شخص ہے جو بیواؤں اور مسکینوں کو جو چیز فائدہ پہنچائے اسے حاصل کرنے کے لیے دوڑ بھاگ کرتا ہے۔

مسکین اور محتاج دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اپنی ضروریات بے تکلفی کے ساتھ بیان کرکے مدد کی درخواست کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن ایسے حاجت مند بھی ہوتے ہیں، جن کی غیرت و خودداری انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ دوسروں کے سامنے اپنی حاجت کا ذکر کریں اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلائیں۔ اس طرح کے افراد معاشرہ کی توجہ کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کی زیادہ فکر ہونی چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لیس المسکین بھذا الطواف الذی یطوف علی الناس فتردہ اللقمة واللقمتان والتمرة و التمرتان قالوا فمن المسکین یا رسول اللہ قال: الذی لایجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ ولا یسئل الناس شیئا[2]

مسکین وہ نہیں ہے جو دستِ سوال پھیلائے لوگوں کا طواف کرتا پھرے اور جسے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک آدھ کھجور دے دو تو لوٹ جائے۔ لوگوں نے سوال کیا پھر مسکین کون ہے؟ آپ نے فرمایا: مسکین وہ ہے کہ جس کے پاس نہ تو اتنا مال ہے جو اسے دوسروں سے بے نیاز کردے اور نہ اس کی حالت ہی کا علم ہوتا ہے کہ اسے صدقہ و خیرات دی جائے، وہ لوگوں سے کچھ نہیں مانگتا۔

یتیم کی کفالت کا صحیح مفہوم

ایک اور مثال لیجیے، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی قرآن و حدیث میں

---

1. فتح الباری: ۹/۴۰۲
2. مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ان الید العلیا خیر من السفلیٰ الخ

بار بار تاکید کی گئی ہے۔ یہ حسن سلوک وقتی طور پر بھی ہوسکتا ہے، لیکن اس کے وسیع تقاضے اسی وقت پورے ہوں گے جب کہ ایک مدت تک اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ اسے معاشی استقلال حاصل ہو اور وہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرے کا بہتر فرد بن سکے۔ ان تقاضوں کی طرف حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت اشارہ کرتی ہے جو اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

کافل الیتیم لہ او لغیرہ انا و ھو کھاتین فی الجنۃ و اشار ما لک بالسبابۃ و الوسطی[1]

یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا (رشتہ دار) ہو یا کسی دوسرے کا، میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح (قریب) ہوں گے۔ امام مالک نے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کرکے بتایا۔

اس حدیث میں 'کفالت' کا لفظ بڑا اہم ہے۔ اس میں اس کی پرورش بھی داخل ہے اور تعلیم اور تربیت اور معاشی انتظام بھی۔ امام نوویؒ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

کافل الیتیم القائم باموره من نفقۃ و کسوۃ و تادیب و تربیۃ وغیر ذٰلک و ھٰذہ الفضیلۃ تحصل لمن کفلہ من مال نفسہ او من مال الیتیم بولایۃ شرعیۃ[2]

یتیم کی کفالت کرنے والا یعنی اس کے نان نفقہ، لباس اور تعلیم و تربیت کا بوجھ اٹھانے والا۔ یہ فضیلت اس شخص کو بھی حاصل ہوگی جو اپنے مال سے اس کی کفالت کرے اور وہ شخص بھی اس کا حق دار ہوگا جو یتیم ہی کے مال سے شریعت نے سرپرستی کا جو حق دیا ہے اس کے مطابق کفالت کرے۔

جو شخص ان تقاضوں کی جس حد تک تکمیل کرے گا اس حد تک وہ اجر و ثواب اور فضیلت کا مستحق ہوگا اور جو اس کا صحیح معنیٰ میں حق ادا کرے گا اسے جنت میں اللہ کے رسولؐ کی رفاقت حاصل ہوگی۔

---

[1] مسلم، کتاب الزھد، باب فضل الاحسان الی الارملۃ والیتیم والمسکین

[2] شرح مسلم: ۲/۴۱۱

روزگار سے لگانے کی ترغیب

حجۃ الوداع کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ صدقہ کا مال تقسیم فرما رہے تھے۔ دو دمی حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انھیں بھی اس میں سے کچھ عنایت کیا جائے۔ پؐ نے دیکھا کہ وہ تندرست وتوانا ہیں تو ناگواری کے ساتھ فرمایا:

ان شئتما اعطیتکما ولا حظ فیھا لغنی ولا لقوی مکتسب [1]

اگر تم چاہو تو میں صدقہ کا مال تمھیں دے دوں، لیکن (معلوم ہونا چاہیے کہ) اس میں کسی مالدار کا اور کسی تندرست وتوانا آدمی کا جو اپنی معاش حاصل کر رہا ہو کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس حدیث میں ولا لقوی مکتسب کا جملہ بڑا اہم ہے۔ یعنی زکوٰۃ میں کسی یسے شخص کا حصہ نہیں ہے جو طاقت رکھتا ہو اور کما رہا ہو۔ امام خطّابی نے اس سے سبِ ذیل استدلال کیا ہے۔

فیہ انه لم یعتبر فی منع الزکوۃ ظاھر القوۃ والجلد دون ان یضم الیه الکسب فقد یکون من الناس من یرجع الی قوۃ البدن و یکون مع ذالک اخرق الید لا یعتمل فمن کان ھذا سبیله لم یمنع من صدقة بدلالة الحدیث [2]

حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی کو زکوٰۃ سے اس کا ذریعہ معاش دیکھے بغیر محض اس لیے منع نہیں کیا جائے گا کہ وہ طاقت ور اور مضبوط ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگ مضبوط بدن کے باوجود بے ہنر ہوتے ہیں، اپنے لیے کچھ کر نہیں پاتے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی یہ حالت ہو صدقہ میں اس کا حق ہے۔ اسے اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص صحت مند اور تندرست تو ہے لیکن روزگار سے نہیں ہے یا اس کے پاس روزگار تو ہے لیکن اس کے لیے ناکافی ہے تو صدقہ اور خیرات سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے اور اس کی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔ آج

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب من یعطی من الصدقۃ وحد الغنی

[2] معالم السنن: ۶۲/۲

کتنے ہی نوجوان ہیں جو محنت و مشقت تو کرسکتے ہیں لیکن محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ذریعۂ معاش اختیار نہیں کر پاتے اور عسرت اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر ان کی یہ رکاوٹ دور کر دی جائے تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکتے ہیں اور انھیں معاشی استقلال حاصل ہوسکتا ہے، لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی منصوبہ نہیں ہے، بلکہ شاید ذہن اس کے تصور ہی سے خالی ہے۔

صنعت و حرفت میں تعاون کی اہمیت

حضرت ابوذرؓ رسول اللہ ﷺ سے اپنی ایک گفتگو نقل فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ سب سے برتر اور افضل عمل کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

ایمان بالله و جهاد فی سبیله، قلت فای الرقاب افضل قال: اغلاهما ثمنا و انفسها عند اهلها قال فان لم افعل قال تعین ضائعا او تصنع لا خرق قال فان لم افعل قال تدع الناس من الشر فانها صدقة تصدق بها علی نفسک[1]

اللہ پر ایمان اور اس کی راہ میں جہاد۔ میں نے دریافت کیا کہ کس قسم کے غلام کو آزاد کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ غلام جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کے نزدیک زیادہ نفیس اور عمدہ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھ میں اس کی استطاعت نہ ہو اور میں یہ کام نہ کرسکوں؟ آپؐ نے فرمایا اس شخص کی مدد کرو، جس کے بچے غربت سے ضائع ہو رہے ہوں یا جو شخص اپنا کام نہ کرسکے۔ میں نے عرض کیا اگر یہ بھی نہ کرسکوں؟ آپؐ نے فرمایا لوگوں کو اپنے ہی شر سے بچاؤ۔ یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کروگے۔

اس حدیث میں پہلے ایمان باللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا 'تعین ضائعا او تصنع لا خرق' اسی کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جائے گی۔ 'تعین ضائعا' کا مطلب یہ ہے کہ

---

[1] بخاری، کتاب العتق، باب ای الرقاب افضل۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان باللہ افضل الاعمال۔

جو شخص غربت میں مبتلا ہو اور جس کے بیوی بچوں کے گزر بسر کی کوئی صورت نہ ہو، اس کی مدد کرو۔ اسے ضائع ہونے سے بچاؤ۔ اس مدد کی مقدار یا اس کی شکل متعین نہیں کی گئی ہے۔ اسے اس شخص کے حالات اور مدد کرنے والے کی حیثیت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ احتیاج جس نوعیت کی ہے اسی نوعیت کی مدد آدمی کو اپنی حیثیت کے مطابق کرنی چاہیے۔

ایک روایت میں 'ضائعا' کی جگہ 'صانعا' کا لفظ آیا ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی ایسے شخص کی مدد کرو، جس کے ہاتھ میں کوئی صنعت یا پیشہ ہے۔ اس کی مدد روپے، پیسے، فنی تعاون، اوزار اور مشینوں کی فراہمی اور پیداوار کے لیے بازار اور مارکیٹ پیدا کرکے کی جاسکتی ہے۔ صاحب حرفت کی مدد کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کی مشکلات کا بالعموم احساس نہیں ہوتا اور اس کی مدد کی طرف ذہن نہیں جاتا۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا او تصنع لاخرق 'اخرق' بے ہنر کو یا ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کوئی کام اچھی طرح نہ کرسکے[2] گویا پہلے ہنر مند کی مدد کا حکم ہوا پھر بے ہنر کی مدد کی طرف توجہ دلائی گئی۔ مطلب یہ کہ جو شخص بے ہنر ہے یا اپنا کام ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا ہے اس کی مدد کی جائے۔ اگر معاشرہ میں اس کا احساس عام ہو اور اس طرح کے ادارے کام کرنے لگیں جہاں صنعت و حرفت کی تعلیم دی جائے، بے ہنر افراد کو ہنر مند بنایا جائے اور ان کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں تو یہ خدمت خلق کی ایک عملی شکل ہوسکتی ہے اور اس سے کم زور طبقات کے معاشی مسائل بڑی حد تک حل ہوسکتے ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی، شرح مسلم: ۶۲/۱۔ ابن حجر، فتح الباری: ۹۰/۵

[2] حافظ ابن حجر نے 'اخرق' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ الذی لیس بصانع ولا یحسن العمل۔ فتح الباری: ۹۰/۵۔ علامہ ابن اثیر کہتے ہیں۔ الاخرق ای جاھل بما یجب ان یعملہ ولم یکن فی یدیہ صنعۃ یکتسب بھا۔ النھایۃ فی غریب الحدیث: ۲۹۸/۱

خدمت کے بعض متعین پہلو

انسان کی وقتی اور ہنگامی خدمت اور اس کے مسائل اور مشکلات کے مستقل حل کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ قرآن و حدیث میں خدمت کے بعض متعین پہلو بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ پہلو ہیں جو معاشرہ کو اوپر اٹھانے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور معاشی اور اقتصادی حیثیت سے ان کے دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی روشنی میں حالات وظروف کے تحت اور پہلو بھی سوچے جاسکتے ہیں۔

مالی تعاون کرنا

خدمت کی ایک صورت مالی تعاون ہے۔ اس کی اہمیت واضح ہے۔ قرآن مجید نے قرابت داروں کا حق پہچاننے، کم زوروں، مجبوروں اور محروموں کی مالی اعانت کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، اس کی کتاب پر اور نبیوںؑ پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود اسے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں پر اور غلاموں کے لیے خرچ کرے اور

وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۷۷)

نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ نیک وہ ہیں جو عہد کرتے ہیں تو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو فقر و فاقہ اور تنگی میں اور جنگ کے وقت صبر کرتے ہیں۔ یہی راست باز ہیں اور یہی متقی ہیں۔

اس آیت میں پہلے اہل کتاب کی رسمی دین داری پر تنقید کی گئی ہے، اس کے بعد حقیقی دین داری کا بیان ہوا ہے۔ یہاں 'بِرّ' کا لفظ بڑا اہم ہے۔ اس کے معنی حقوق ادا کرنے کے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی آتے ہیں اور بندوں کے حقوق بھی۔ اس میں مواسات، ہم دردی اور احسان کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ خیر کے تمام کاموں پر حاوی ہے۔ اس پہلو سے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بھی ہے۔[1]

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کے لیے خدا اور بندوں دونوں ہی کے حقوق کا پہچاننا ضروری ہے۔ آدمی برّ وتقویٰ کے بلند مقام کو اسی وقت پاسکتا ہے جب کہ اس کے دل میں ایمان کا نور جگمگا رہا ہو اور وہ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں، محکوموں، غلاموں اور معاشرہ کے دیگر کم زور افراد اور طبقات پر محنت سے کمائی ہوئی اپنی دولت صرف کرے۔ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر بھی اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے ہے۔ نماز اللہ سے تعلق اور زکوٰۃ انسانوں کی خدمت کی بالکل متعین شکلیں ہیں۔ بعض دوسری آیتوں میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان کا مال تنہا اس کا نہیں ہے، بلکہ اس میں معاشرہ کے کم زوروں اور ناداروں کا حق ہے۔ اس حق کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

---

[1] علامہ حمید الدین فراہیؒ فرماتے ہیں۔ البر اصلہ ایفاء الحق فتفرع منہ ما یکون ایفاء للحقوق الاصلیۃ من الطاعۃ للرب والابوین والمواساۃ بالناس ومن ھذہ الجھۃ صار بمعنی الاحسان واشتمل الخیرات و صار وصفا للرب تعالیٰ (مفردات القرآن، ص۲۶۴)

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ○ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ○
(بنی اسرائیل: ۲۶، ۲۷)

قرابت دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

یہاں یہ بتانے کے بعد کہ انسان کے مال میں دوسروں کا بھی حق ہے، اسراف اور تبذیر سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اسراف اور تبذیر میں مبتلا ہو وہ دوسروں کا حق نہیں پہچان سکتا۔

یہی آیت ایک دوسرے سیاق میں سورۂ روم میں آئی ہے:

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○
(الروم: ۳۷، ۳۸)

کیا یہ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (جب یہ حقیقت ہے کہ جس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے) تو تم قرابت دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ روم دونوں ہی مکی سورتیں ہیں۔ مکہ میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی، لیکن ان آیات میں قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق بیان ہوا ہے۔ امام رازی سورۂ روم کی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا واجب ہے۔ زکوٰۃ کے لیے حولانِ حول شرط ہے۔ یہاں یہ شرط نہیں ہے۔ انسان کو مستحقین کے ساتھ حسنِ سلوک بہر حال کرنا ہوگا اس لیے

کہ یہاں (زکوۃ کا نہیں) مخلوق کے ساتھ عام شفقت کا ذکر ہے۔ قرابت دار، مسکین اور مسافر یہ تین طبقات وہ ہیں جن کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنا ضروری ہے، چاہے احسان کرنے والے کے پاس زائد از ضرورت مال ہو یا نہ ہو[1]

ان آیات کا ایک غور طلب پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ معاشرہ کے کم زور افراد پر انسان مال خرچ کر کے ان پر کوئی احسان نہیں کرتا، بلکہ یہ ان کا حق ہے جسے وہ ادا کرتا ہے۔ یہی تصور سرمایہ دار کو کم زوروں کے استحصال سے روکتا ہے۔ اگر دولت مند کو یہ احساس ہو کہ اس کے پاس جو دولت ہے اس میں دوسروں کا بھی حق ہے اور اس حق کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے تو وہ کش مکش قطعی وجود میں نہیں آسکتی جو غریب اور امیر کے درمیان آج پائی جاتی ہے۔

قرض کے ذریعے مدد کرنا

بعض اوقات آدمی کو اپنی معاشی حالت ٹھیک کرنے یا کسی ناگہانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مالی مدد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ مدد نہ پہنچے تو اس کے حالات زیادہ خراب ہوسکتے ہیں اور اس کی مشکلات میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس کی مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسے قرض دیا جائے تاکہ وہ بر وقت اپنی ضرورت پوری کرلے اور پھر قرض دینے والے کو اس کی رقم واپس کردے۔ یہ بھی دراصل کسی ضرورت مند کے ساتھ تعاون کی ایک صورت ہے۔ احادیث میں اس کی بڑی فضیلت اور ثواب بیان ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

ما من مسلم یقرض مسلماً قرضاً مرتین الا کان کصدقتها مرة[2]	جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دیتا ہے وہ گویا ایک مرتبہ صدقہ کرتا ہے۔

---

[1] رازی: تفسیر کبیر: جلد ۱۳ جزء ۲۵، ص ۱۰۹

[2] ابن ماجہ، ابواب الصدقات، باب القرض۔ اس حدیث کی سند پر تنقید کی گئی ہے۔ دارِ قطنی نے کہا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے۔ ملاحظہ ہو نیل الاوطار: ۳۴۷/۵

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ قرض کی فضیلت کے سلسلے میں احادیث موجود ہیں۔
ـن کی تائید قرآن و حدیث کے ان عمومی بیانات سے بھی ہوتی ہے، جن میں مسلمانوں
ـی ضرورت پوری کرنے، ان کا تعاون کرنے، ان کی مشکلات کو رفع کرنے اور ان کے
ـر و فاقہ کو دور کرنے کا صراحت سے ذکر ہے۔ اس میں قرض دنیا بھی شامل ہے۔
ـلمانوں کے درمیان اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن رسلان کہتے
ـں: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وقت ضرورت آدمی قرض کی درخواست کرسکتا
ہے، اس کی وجہ سے قرض مانگنے والے کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اگر اس
ـں کوئی قباحت ہوتی تو نبی ﷺ قرض نہ لیتے۔[1]

کاروباری زندگی میں قرض کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے کسی کاروبار کے شروع
ـرنے، اسے جاری رکھنے اور وقتاً فوقتاً پہنچنے والے نقصانات پورا کرنے میں مدد ملتی
ہے۔ موجودہ دور میں تو قرض کاروبار کا ایک ضروری جزو بن گیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے
ـہ قرض کا لین دین بند ہوجائے تو بڑے بڑے کاروباری ادارے ختم ہوجائیں، لیکن
ـج کا مادی ذہن قرض کو مادی منفعت کا بہترین ذریعہ تصور کرتا ہے۔ اس لیے بغیر سود
ـے کوئی کسی کو قرض دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ شرح سود زیادہ سے زیادہ رکھنا چاہتا
ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرض دار جب قرض سے خود نفع حاصل کرتا
ہے تو قرض دینے والے کو بھی اس کا ایک حصہ ملنا چاہیے۔ یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ جس
ـص نے قرض دیا ہے اس کو نظر انداز کر کے اس کے پیسے سے تنہا قرض دار فائدہ اٹھاتا
ـا جائے۔

دوسرے یہ کہ آج پوری دنیا میں سکّہ کی قیمت میں کمی کا عام رجحان ہے، اس
ـت بازار میں سو روپے کی جو قیمت ہے ایک سال میں وہ گھٹ کر اسّی یا نوّے روپے
ـجائے گی۔ اس طرح ایک سال کے بعد سو روپے کی واپسی کا مطلب اصلاً اسّی یا

---

[1] شوکانی، نیل الاوطار: ۳۴۷/۵

توّے روپے کی واپسی ہوتی ہے۔ اس میں قرض دینے والے کا سراسر نقصان ہے۔ ا
قسم کے دلائل کی بنیاد پر سود کے لیے وجہ جواز فراہم کی جاتی ہے۔

اسلام اس مادّی ذہن کے خلاف ہے۔ وہ قرض کو نفع حاصل کرنے کا ذر
نہیں سمجھتا، بلکہ اس کے نزدیک یہ ایک طرح کا احسان ہے، جو کسی ضرورت مند
ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ قرض دار سے سکّے کی قیمت کی روز افزوں کی
حساب کرکے سود در سود وصول کرنے کی جگہ اس کے ساتھ ممکنہ رعایت کی جائے۔
ادائگی کے لیے مزید وقت اور مہلت مانگے تو اسے مزید وقت اور مہلت دی جائے اور
مشکلات کی وجہ سے وہ قرض ادا نہ کرسکے تو اسے معاف بھی کر دیا جائے۔ قرآن
میں سود کی حرمت کے اعلان کے ساتھ قرض کے سلسلے میں اسی اعلیٰ اخلاقی رویہ کی تعا
دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ○ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ○ (البقرۃ:۲۷۸-۲۸۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود تمھار
دوسروں پر رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم
ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم یہ نہیں کرتے ہو تو اللہ
اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیا
ہو جاؤ۔ اگر تم سود لینے سے توبہ کرلو تو تمھیں
اپنا اصل مال لینے کا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم
کروگے اور نہ کوئی دوسرا تم پر ظلم کرے گا۔
قرض دار تنگ دست ہے تو اس کی کشائش
تک اسے مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمھارے
لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ اور ڈرتے رہو اس
دن سے جس دن کہ تم اللہ کی طرف لوٹائے
جاؤ گے۔ پھر ہر نفس نے جو کچھ یہاں کمایا
ہے اس کا پورا بدلہ اسے دیا جائے گا اور ان پر
ظلم نہ ہوگا۔

احادیث میں ایک طرف تو قرض دار کو بہتر طریقے سے قرض ادا کرنے کا

گیا ہے اور دوسری طرف قرض دینے والے کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ قرض دار کے تھ نرمی کا معاملہ کرے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے اونٹ ض لیا تھا۔ وہ آپؐ سے بڑی درشتی کے ساتھ (غالباً وہ یہودی یا بدوی تھا) مطالبہ نے لگا۔ صحابۂ کرامؓ نے اس کا سخت جواب دینا چاہا تو آپؐ نے فرمایا 'دعوہ فان احب الحق مقالا' (جانے دو، جس کا حق ہے وہ سختی سے بولنے کا بھی حق رکھتا ہے) اونٹ خرید کر اسے دے دو۔ صحابہؓ نے عرض کیا اس نے جس عمر کا اونٹ دیا تھا وہ تو ں ہے، البتہ اس سے بہتر اونٹ مل رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہی خرید کر دے دو۔ 'فانّ رکم احسنکم قضاء' (اس لیے کہ تم میں بہتر آدمی وہ ہے جو اچھے طریقے سے اپنا ض ادا کرے)۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے قرض دار کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کی فضیلت ان ظ میں بیان فرمائی ہے:

ن انظر معسراً او وضع عنه اظله لله فی ظله[2] — جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا قرض کو معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ن انظر معسراً او وضع له اظله لله یوم القیامة تحت ظل العرش رم لا ظل الا ظله[3] — جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس کے قرض کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا، جس روز کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے

---

[1] اری، کتاب فی الاستقراض، باب استقراض الابل۔ مسلم کتاب المساقات، باب جواز اقتراض الحیوان الخ
[2] سلم، کتاب الزہد، باب حدیث جابر الطویل وقصة ابی الیسر۔
[3] ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی انظار المعسر۔

دولت دی تھی، وہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اس نے ملازمین کو تاکید کر رکھی تھی۔ 'اد
انظروا المعسر و تجاوزوا الموسر' (جو تنگ حال ہے قرض کے وصول کرنے میں
اسے مہلت دیں اور جو خوش حال ہے اس سے ادائگی میں کچھ کمی بیشی ہو تو نظر اندا
کردیں) اللہ تعالیٰ نے اس کے اس نیک عمل کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کر دیا۔[1]

ایک مرتبہ ایک قرض دار نے قرض خواہ سے رعایت کا مطالبہ کیا۔ اس پر دونوں
میں تکرار ہونے لگی۔ قرض خواہ نے قسم کھا کر کہا میں کسی قسم کی رعایت نہیں کروں گا۔
آپؐ حجرے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا نیکی نہ کرنے کی قسم کس نے کھائی تھی؟ اس
نے کہا حضورؐ میں نے ہی قسم کھائی تھی (یہ میری غلطی تھی) اب، وہ جو صورت پسند کرے
اس پر عمل ہوسکتا ہے۔[2]

ابن ابی حدرد نے حضرت کعب بن مالکؓ سے قرض لیا تھا۔ انھوں نے اس کا
مطالبہ کیا۔ وہ مجبوری کی وجہ سے ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ جب بات بڑھی تو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب کو آواز دی اور اشارے سے فرمایا: نصف معاف کردو اور
نصف لے لو۔ چناں چہ انھوں نے صرف آدھا قرض وصول کیا اور آدھا معاف کر دیا۔[3]

قرض کا پیسہ ڈوب جائے یا قرض دار اسے ادا نہ کرسکے تو اس کے احکام
مسائل الگ ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی
ضرورت مند کو قرض دینا، اس کے ساتھ تعاون ہے۔ اس کا معاوضہ ڈھونڈنا خالص سودی
ذہن ہے۔ اسلام اس کے خلاف ہے، جسے قرض دیا جائے اس کے ساتھ لطف و محبت
اور نرمی کا رویہ اختیار کرنا، اس کی کم زوری سے فائدہ نہ اٹھانا، اس کی مجبوریوں کی رعایت

۱۔ بخاری، کتاب البیوع، باب من انظر معسراً۔ مسلم، کتاب المساقات، باب فضل انظار المعسر ا
۲۔ بخاری، کتاب الصلح، باب ھل یشیر الامام بالصلح۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب
استحباب الوضع من الدین۔
۳۔ بخاری، کتاب الصلح، باب ھل یشیر الامام بالصلح۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب
استحباب الوضع من الدین

رنا اور اسے ممکنہ سہولتیں فراہم کرنا، یہ سب حسن سلوک اور خدمت کی تعریف میں آتا
ہے۔ اسلام اسی کی تعلیم دیتا ہے۔

روررت کی چیز ہبہ کرنا

خدمت اور حسن سلوک کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کی ضرورت کی کوئی
ہبہ کردی جائے۔ لسان العرب میں ہبہ کے معنی ان الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔

لعطیة الخالیة عن الاعواض الاغراض[1] — ہبہ اس عطیے کو کہا جاتا ہے جو کسی بدلے یا غرض سے خالی ہو۔

فقہ میں ہبہ کی تعریف یہ ہے:

ی تملیک العین بلا عوض[2] — کسی چیز کا مالک بنا دینا اس کا عوض لیے بغیر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز ہبہ کی جائے اس کے بدلے میں کوئی چیز نہ
جائے اور اس سے کوئی غرض بھی وابستہ نہ ہو، بلکہ جو چیز ہبہ کی جائے وہ محض اللہ تعالیٰ
رضا جوئی کے لیے کی جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آدمی ہبہ کی ہوئی چیز کو قیمتاً بھی
زیدے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو جو جہاد میں جا رہا تھا ایک
ہ گھوڑا ہبہ کیا۔ لیکن وہ شخص مالی لحاظ سے کم زور تھا، گھوڑے کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ
سکا، اس کی وجہ سے گھوڑا ضائع ہونے لگا، مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اسے فروخت
دے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

تشتره و ان اعطاکه بدرهم احد فان العائد فی صدقته کا لکلب یعود فی قیئه[3] — اسے نہ خریدو، چاہے وہ ایک درہم ہی میں وہ تمھیں کیوں نہ دے۔ اس لیے کہ جو شخص اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کو واپس لیتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کتا قے کرکے اسے دوبارہ چاٹنے لگے۔

---

[1] بن منظور، لسان العرب مادہ و۔ہ۔ب [2] نسفی، کنز الدقائق، ص ۳۰۸

[3] بخاری، کتاب الھبۃ، باب لا یحل لاحد ان یرجع فی ھبتہ و صدقتہ۔ مسلم، کتاب الھبات،
، کراھۃ شراء الانسان ما تصدق بہ۔

یہ بہت چھوٹی حرکت ہے کہ آدمی کسی کو کوئی چیز دے کر پھر اسے واپس لے لے اس سے نفس کے اندر ہم دردی اور محبت کے جو پاک جذبات ایک مرتبہ پیدا ہوئے تھے وہ مجروح ہوتے ہیں اور مال کی محبت زیادہ شدت کے ساتھ ابھر آتی ہے۔ ہبہ یا صدقہ کی ہوئی چیز کو دوبارہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے سابقہ اقدام پر پچھتا رہا ہے جسے اس نے ہبہ کیا ہے، اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اگر آدمی کسی کے ساتھ ہم دردی اور محبت کا اقدام نہ کرے تو شاید اس کی عزتِ نفس کو اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا کہ اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینے سے اسے پہنچ سکتا ہے۔ ہبہ کی ہوئی چیز کو خریدنے سے بھی اس لیے منع کیا گیا ہے کہ اس میں یہ امکان ہے کہ ہبہ کرنے والا اپنے سابقہ احسان سے فائدہ اٹھائے اور جسے ہبہ کیا گیا ہے وہ بھی اس کے ساتھ بادل ناخواستہ ہی سہی رعایت کرنے پر مجبور ہو جائے۔[1]

کوئی چیز عاریتاً دینا

خدمت اور تعاون کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو عاریتاً کوئی چیز دی جائے تاکہ وہ ایک متعین مدت تک فائدہ اٹھانے کے بعد اسے واپس لوٹا دے۔ حدیث میں اسے بھی بہترین صدقہ اور عطیہ کہا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نعم الصدقة اللقحة الصفی منحة   بہترین صدقہ یہ ہے کہ کسی کو بہ طور عطیہ

---

[1] فقہ حنفی کی رو سے ہبہ سے رجوع کرنے میں بعض موانع نہ ہوں تو ہبہ کرنے والے کو رجوع کا اختیار ہے، لیکن اسے مکروہ تنزیہی بلکہ مکروہ تحریمی کہا گیا ہے (در المختار مع رد المحتار: ۴/۷۰۹ اور اس سے آگے) امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعی کے نزدیک اس حدیث کا تعلق کسی اجنبی کو ہبہ کرنے سے ہے۔ اگر اولاد یا ان کی اولاد۔ یہ سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے۔ کو ہبہ کیا گیا ہے تو اس سے رجوع بھی ہوسکتا ہے (نووی، شرح مسلم: ۲/۳۶) تفصیلات فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

الشاۃ الصفی منحۃ تغدو باناء و تروح باٰخر[1]	(چند دن کے لیے) بہت ہی عمدہ گابھن اونٹنی دی جائے جو (جلد ہی خوب دودھ دینے لگے) یا عمدہ بکری دی جائے جو صبح ایک برتن بھر کر اور شام ایک برتن بھر کر دودھ دے۔

یہ بخاری کی روایت ہے، مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

الا رجل یمنح اھل بیت ناقۃ تغدو بُعسٍ و تروح بعس ان اجرھا لعظیم[2]	جو شخص کسی گھر والے کو اونٹنی دے جو اُسے صبح ایک بڑا برتن بھر کر اور شام ایک بڑا برتن بھر کر دودھ دے تو اس کا اجر بے شک بڑا ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

من منح منیحۃ لبن او ورقٍ او ھدی زقاقاً کان لہ مثل عتق رقبۃٍ[3]	جو شخص چند دن کے لیے کسی کو دودھ دینے والا جانور یا چاندی (روپے پیسے قرض) دے یا کسی کو راستہ دکھادے تو اس کا اتنا ثواب ہوگا جتنا ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ہوتا ہے۔

چاندی دینے سے یہاں مراد جیسا کہ امام ترمذی نے لکھا ہے قرض ہے۔[4]

”ھدی زقاقا“ کا ایک ترجمہ تو یہی ہے کہ اس نے راستہ دکھایا۔ یہی الفاظ سے قریب تر ہے۔[5] لیکن بعض لوگوں نے اسے ’ھدّی زقاقا‘ بھی روایت کیا ہے۔ زقاق، تنگ گلی اور درختوں کی روکو کہتے ہیں[6] اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں اس شخص کا ثواب بیان ہوا ہے، جس نے اپنے باغ میں سے درختوں کی ایک رو کسی کو تحفہ کے طور پر دے دی۔

۱؎ بخاری، کتاب الاشربۃ، باب شرب اللبن
۲؎ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل المنیحہ
۳؎ ترمذی، ابواب البر والصلہ، باب ما جاء فی المنحہ
۴؎ معنی قولہ، من منح منیحۃ ورق انما یعنی بہ قرض الدراہم (ترمذی حوالہ سابق)
۵؎ ابن منظور، لسان العرب، مادہ، ز،ق،ق
۶؎ ابن اثیر، النہایہ فی غریب الحدیث ۴/۲۴۴

ان حدیثوں کے دو تین پہلو اہم اور قابلِ غور ہیں:

ایک یہ کہ بہ طور قرض جو رقم دی جاتی ہے یا عارضی طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے جو جانور دیا جاتا ہے اسے ان حدیثوں میں صدقہ اور منیحہ (عطیہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے گو کہ یہ چیزیں ایک خاص مدت کے بعد واپس ہو جاتی ہیں، لیکن ان کے ذریعے مشکل وقت میں انسان کی مدد ہوتی ہے: اس لحاظ سے یہ بھی ایک طرح کا صدقہ اور احسان ہے۔ عارضی مدد بھی بعض اوقات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی اہمیت کو یہاں واضح کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ حدیث میں گو کہ کسی غریب کو جانور کے دودھ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دینے کا ثواب بیان ہوا ہے، لیکن اس کے لیے 'مَنَحَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس میں وسعت ہے۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی کو جانور کے بال، اون، کھاد اور اس کے بچے سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔[1]

ایک ہی نوعیت کی دو چیزیں دینا

حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں جو چیز بھی دے وہ ایک سے دو دے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من انفق زوجین فی سبیل اللہ نودی من ابواب الجنۃ یا عبد اللہ ھذا خیر[2]

جو شخص اللہ کی راہ میں کوئی بھی دو چیزیں دے اسے جنت کے دروازوں سے آواز دی جائے گی کہ اے اللہ کے بندے یہ ہے کارِ خیر (یعنی تم نے نیکی کا بڑا کام انجام دیا ہے)

حضرت ابوذرؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما من عبد مسلم ینفق من کل مال لہ زوجین فی سبیل اللہ الا

جو بندۂ مسلم بھی اپنے ہر مال میں سے ایک جوڑا اللہ کے راستہ میں خرچ کرے گا، قیامت

[1] فیروز آبادی، قاموس: مادہ م،ن،ح، ص ۲۶۸۔ ابن اثیر، النہایہ فی غریب الحدیث: ۱۱۰/۴

[2] بخاری، کتاب الصوم، باب الریان للصائمین۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب من ضم الی الصدقۃ الخ

استقبلته حجبة الجنة كلهم يدعوه الى ما عنده، قلت و كيف ذالك قال ان كانت ابلاً فبعيرين و ان كانت بقرة فبقرتين[1]

کے روز جنت کے دربان اس کا ہر طرف سے استقبال کریں گے۔ ان میں سے ہر ایک اسے ان نعمتوں کی دعوت دے گا، جو اس کے پاس ہوں گی۔ میں نے دریافت کیا کہ ایک جوڑا خرچ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا (جیسے) اگر اونٹ ہوں تو دو اونٹ، گائیں ہوں تو دو گائیں۔

ان احادیث کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان میں انفاق کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور صاحبِ مال کو اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرے۔

ان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان میں سوسائٹی کے کم زور طبقات کی ضرورتوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور صاحبِ حیثیت افراد کو انھیں پورا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آدمی کی ضروریات کبھی اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اسے ایک ہی نوعیت کی دو چیزیں دی جائیں۔ جیسے ہل جوتنے، سینچائی کرنے یا سامان ڈھونے والی گاڑی کے لیے دو بیلوں یا دو بھینسوں کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کے اخراجات ہی اتنے زیادہ ہوں کہ اس کے لیے دودھ والی ایک گائے یا بھینس ناکافی ہو، ظاہر ہے، جس کی جتنی بڑی ضرورت پوری کی جائے گی اس کا اتنا ہی بڑا اجر و ثواب ہوگا۔ حدیث میں راہِ خدا میں ایک سے دو گائیں دینے کا ثواب بیان ہوا ہے، اسے ایک مثال سمجھنا چاہیے۔ زوجین کے لفظ کے اندر وسعت ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک جنس کی دو چیزیں۔ اس میں روپے، پیسے، کپڑا اور دیگر ساز و سامان بھی شامل ہے۔ اس میں زراعت کے آلات اور مشینیں وغیرہ بھی آسکتی ہیں۔

بعض لوگوں نے 'فی سبیل اللہ' سے جہاد مراد لیا ہے لیکن جیسا کہ قاضی عیاض

---

[1] نسائی، کتاب الجهاد، باب فضل النفقة فی سبیل اللہ عزوجل

نے لکھا ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان الفاظ میں نیکی اور حسن سلوک کے سارے کا
آ جاتے ہیں[1]

کاروبار میں شریک کرنا

کاروبار کے لیے سرمایہ اور محنت دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی آدمی کے پاس سرمایہ تو ہوتا ہے لیکن جس قسم کی محنت کرنی چاہیے وہ نہیں کر پاتا، کبھی محنت کے قابل تو ہوتا ہے لیکن مطلوبہ سرمایہ مفقود ہوتا ہے۔ محنت اور سرمایہ کو جمع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ فراہم کرے اور محنت کرنے والا محنت کرے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں مضاربت کہا جاتا ہے۔ مضاربت کی تعریف علامہ ابن اثیر نے ان الفاظ میں کی ہے:

المضاربة ان تعطى مالاً لغيرك يتجر فيه فيكون له سهم معلوم[2]	مضاربت یہ ہے کہ تم کسی کو مال دو تا کہ وہ اس سے تجارت کرے اور اس میں اس کا ایک متعین حصہ ہو۔

ہدایہ میں ہے کہ ایک جانب سے مال اور دوسری جانب سے عمل کی بنیاد پر نفع میں شرکت کو مضاربت کہا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور شرعی حیثیت پر اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے کہ مضاربت ہمیشہ سے جائز رہی ہے، اس لیے کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کے پاس مال تو ہوتا ہے لیکن صحیح طریقہ سے وہ اس کا استعمال نہیں کرسکتے۔ بعض لوگ اس کا صحیح استعمال تو جانتے ہیں لیکن خالی ہاتھ ہوتے ہیں، اس لیے مضاربت کی ضرورت پیش آتی ہے تا کہ ناسمجھ اور سمجھ دار، محتاج اور دولت مند دونوں طرح کے لوگوں کی ضروریات پوری ہوں۔ نبی ﷺ کی بعثت کے وقت اس پر عمل ہو رہا تھا۔ آپؐ نے اسے باقی رکھا اور صحابہؓ نے اس پر عمل کیا[3]

---

[1] نووی، شرح مسلم: ۱/۳۳۰۔ فی سبیل اللہ کے بعض پہلوؤں کی طرف حافظ ابن حجرؒ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ فتح الباری، ۷/۱۹

[2] النہایۃ فی غریب الحدیث: ۳/۱۴

[3] مرغینانی، ہدایہ: ۳/۲۵۵

صحابہؓ کے اس پر عمل کا ثبوت حضرت عبد اللہ بن ہشام کی روایت سے ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بچپن میں ان کی والدہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئیں۔ آپؐ نے ان کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا فرمائی۔ اس کے اثر سے کاروبار میں انھیں بڑا فائدہ ہوتا تھا۔ ان کے پوتے زہرہ بن معبد کہتے ہیں کہ میں اپنے دادا کے ساتھ بازار جایا کرتا تھا، وہ غلہ خریدتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ ان سے ملاقات کرتے اور کہتے کہ اس سودے میں ہمیں بھی شریک کرلو۔ بعض اوقات وہ ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر سامان نفع میں حاصل کرکے گھر بھیجتے تھے۔[1]

علامہ ابو القاسم خرقی فرماتے ہیں کہ کاروبار میں شرکت کا جواز کتاب، سنت اور اجماع تینوں سے ثابت ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ شرکت کے جواز پر مسلمانوں کا فی الجملہ اجماع ہے، اختلاف ہے تو اس کی بعض شکلوں کے بارے میں ہے۔[2]

شرکت سرمایے میں بھی ہوسکتی ہے اور محنت میں بھی۔ دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ آج کے دور میں کاروبار اتنا پیچیدہ ہوگیا ہے کہ آدمی چھوٹے موٹے سرمایے سے کوئی بڑا کاروبار نہیں کرسکتا، جو لوگ بڑا کاروبار کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا سرمایہ یکجا کرکے کمپنیاں قائم کرتے ہیں، ان ہی کمپنیوں کے ذریعے بڑے کاروبار ہوتے ہیں۔ سرمایہ لگانے والے ان میں شریک اور حصہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ خدمتِ خلق کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایسی کمپنیاں قائم ہوں، جس میں کم پیسے والے بھی شریک ہوکر ترقی کرسکیں۔

موجودہ دور میں فنی مہارت اور صنعتی تجربے نے غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ اس کے بغیر کوئی کارخانہ یا فیکٹری نہیں چلائی جاسکتی۔ بڑے بڑے صنعتی اداروں

---

[1] بخاری، کتاب الشرکۃ، باب الشرکۃ فی الطعام وغیرہ

[2] ابن قدامہ المغنی: ۵/۳

میں تو مختلف قسم کے فنی ماہرین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض اوقات محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح کے ماہرین صنعتی میدان میں آگے نہیں بڑھ پاتے، ان کے ساتھ تعاون کی ایک بہترین شکل یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنی صنعت میں انھیں حصہ دار بنائیں اور شرکت کی بنیاد پر ان کا تعاون حاصل کریں، لیکن آج کا سرمایہ دارانہ ذہن کسی کو ملازم تو رکھ سکتا ہے لیکن کاروبار میں شریک نہیں کرسکتا۔

زراعت میں شریک کرنا

زراعت اور کھیتی باڑی میں بھی شرکت ہوسکتی ہے۔ موجودہ دور میں بڑے بڑے فارموں کے وجود میں آنے، زراعت کے طریقوں کے بدل جانے اور مشینوں اور آلات کے عمل دخل کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ احادیث میں بٹائی پر زراعت کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کی زمین پر دوسرا شخص زراعت کرے، باغ ہو تو اس کی دیکھ بھال اور ضروریات کا انتظام کرے اور جو آمدنی ہو وہ طے شدہ شرائط کے مطابق دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ہجرت کے بعد انصارؓ نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے کھجور کے باغات کو آپ ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرما دیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ نہیں ہوگا، اس پر انصار نے کہا کہ مہاجرین ان باغات کی دیکھ بھال اور آب پاشی کا نظم کریں اور جو فصل آئے وہ ہمارے اور ان کے درمیان تقسیم ہو جائے، اسے مہاجرین نے تسلیم کرلیا۔[1]

حضرت ابوجعفر باقرؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں مہاجرین کے جتنے خاندان تھے سب ہی ایک تہائی، چوتھائی (جیسے طے ہو) پر زراعت کرتے تھے۔ (صحابہ میں) حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (تابعین میں) عمر بن عبدالعزیز، قاسم بن

---

[1] بخاری، کتاب المزارعہ، باب اذا قال اکفنی مؤنۃ النخل وغیرہ

مد، عروہ بن زبیر اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے گھرانوں کے افراد اور
بن سیرین نے اس پر عمل کیا ہے۔

عبد الرحمٰن بن اسود کہتے ہیں کہ میں عبد الرحمٰن بن یزید کے ساتھ زراعت میں
شریک رہا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ باغات اور زمینوں کو بٹائی پر اس شرط کے ساتھ دیتے تھے
کہ اگر بیج وغیرہ ان کے ذمے ہو تو پیداوار کا نصف ان کا ہوگا لیکن اگر کاشت کار کھیتی کا
سامان ہل وغیرہ اور بیج فراہم کریں تو وہ دو تہائی کے اور حضرت عمرؓ ایک تہائی کے حق دار
ہوں گے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ زمین دار اور
کسان دونوں مل کر خرچ کریں اور جو آمدنی ہو وہ طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم ہو
جائے۔ امام زہری کی بھی یہی رائے ہے۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اس شرط پر کپاس چنی جاسکتی ہے کہ محنت کرنے والا
(مثال کے طور پر) نصف کا مالک ہوگا۔ ابن سیرین، عطاء، حکم، زہری اور قتادہ کہتے ہیں
کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ بنکر کو سوت اس شرط پر فراہم کیا جائے کہ تیار شدہ کپڑے کا
ایک تہائی یا چوتھائی اسے ملے گا۔

معمر کہتے ہیں کہ ایک متعین مدت کے لیے جانور اس شرط پر دیے جاسکتے ہیں
کہ جو آمدنی ہوگی اس کا تہائی یا چوتھائی مالک کو ملے گا[1]

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے ایسا ماحول پیدا کیا تھا کہ اس
میں وسائل و ذرائع اور قوت و صلاحیت سے یکساں فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ ہمارے معاشرے

---

[1] بخاری، کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ بالشرط ونحوہ۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ فتح الباری:
۵/۷۷-۹۷۔ زمین کے معاملے میں مشارکت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہے، لیکن صاحبین
(امام یوسف اور امام محمد) نے اسے جائز قرار دیا ہے فقہ حنفی کا فتویٰ صاحبین ہی کے قول پر
ہے۔ ہدایہ ۳/۴۲۲، ۴۲۳۔ دیگر ائمہ نے بعض جزوی اختلافات کے باوجود اسے جائز قرار دیا
ہے۔ تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کی گئی ہے۔

کی خرابی یہ ہے کہ جو وسائل و ذرائع موجود ہیں، ان کا صحیح استعمال نہیں ہو پاتا اور جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں وہ بھی منجمد پڑی رہتی ہیں۔ جس معاشرہ میں وسائل و ذرائع اور محنت و صلاحیت دونوں سے فائدہ اٹھایا جائے اس کی معیشت کی راہ کی رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔

مشورہ دینا

انسان قدم قدم پر اچھے مشورے کا محتاج ہوتا ہے۔ تعلیم، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت، سفر، مرض و صحت غرض یہ کہ زندگی کے بہت سے معاملات میں اسے مشورے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ موجودہ دور کے قوانین اور ضابطوں نے ہر معاملے میں اتنی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں کہ آدمی اس کے تمام پہلوؤں سے کماحقہٗ واقف نہیں ہو پاتا۔ بعض اوقات صحیح مشورہ نہ ملنے کی وجہ سے بڑی زحمتیں اور نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف مسائل میں مشورہ دینے کے لیے آج بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ حدیث میں کسی کو بر وقت صحیح اور ٹھیک مشورہ دینے کی فضیلت آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

من دل علی خیر فلہ نصف اجر فاعلہ[۱]

جس نے کسی خیر کی طرف راہ نمائی کی تو اسے اس پر عمل کرنے والے کا نصف ثواب ملے گا۔

اسی طرح جانتے بوجھتے اور دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینے کو خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ و من اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ[۲]

جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا (اور اس نے اس پر عمل کیا) تو گناہ اس شخص پر ہوگا، جس نے فتویٰ دیا۔ جس نے اپنے بھائی کو یہ جانتے ہوئے کسی بات کا مشورہ دیا کہ اس کا فائدہ اور بھلائی دوسری بات میں ہے تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔

---

[۱] مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل اعانۃ الغازی فی سبیل اللہ۔

[۲] ابوداؤد، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا۔

موجودہ تہذیب و تمدن نے جو مسائل پیدا کردیے ہیں، وہ بڑے پیچیدہ ہیں،
بن ہمارے یہاں ایسے ادارے نہیں ہیں جو ان کے سلسلے میں صحیح رہ نمائی فراہم کریں،
رید اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھانے کی تدبیریں بتائیں اور اس سلسلے میں اسلامی
طۂ نظر واضح کریں۔

ظلوم کی مدد کرنا

خدمت خلق کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں جن افراد اور طبقات پر ظلم
رہا ہو، ان کی مدد کی جائے۔ اسلام ہر طرح کے ظلم کے خلاف ہے۔ وہ ایک طرف تو
لم کے ارتکاب سے سختی سے منع کرتا ہے اور دوسری طرف اس بات کی ہدایت کرتا ہے
ہ کسی پر زیادتی ہو تو معاشرہ اسے خاموشی سے برداشت نہ کرے، ظالم کے خلاف آواز
ھائے، اسے ظلم سے باز رکھے، مظلوم کو اس کی چیرہ دستی سے بچائے اور اس کی ہر ممکنہ
د کرے[1]

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات باتوں
حکم دیا۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ مظلوم کی مدد کی جائے[2]
امام نوویؒ نے مظلوم کی مدد کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور اسے امر بالمعروف اور
ی عن المنکر میں شمار کیا ہے[3] اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی جان و مال پر زیادتی ہو،

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کا مقالہ 'اسلام کم زور کی ظلم سے حفاظت کرتا ہے' سہ ماہی
قیقات اسلامی علی گڑھ، جلد۲، شمارہ۲، اپریل- جون ۱۹۸۳ء

امرنا رسول اللہ ﷺ بسبع ونہانا عن سبع۔ امرنا بعیادۃ المریض ... ونصر المظلوم۔ بخاری کتاب
دب، باب تشمیت العاطس اذا حمد اللہ۔ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم استعمال اناء
ذھب الخ

شرح مسلم: ۱۸۸/۲۔ مظلوم کی مدد کن حالات میں فرض ہو جاتی ہے اور کن حالات میں وہ
ض نہیں رہتی، صرف اس کا جواز باقی رہتا ہے، یا مظلوم کی مدد کب اور کس وقت ہونی چاہیے؟
ں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری: ۶۱/۵

اس کی عزت و آبرو پر حملے ہوں، اس کا گھر لوٹا جارہا ہو یا اس کی جائداد نذر آتش کی جارہی ہو تو آس پاس کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی مدد کے لیے کھڑے ہوجائیں۔ اگر کچھ لوگوں کا خاطر خواہ تعاون اسے حاصل ہوجائے تو یہ فرض سب سے ساقط ہو جائے گا، لیکن اگر کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی تو سب کے سب گنہ گار ہوں گے۔

مظلوم کی مدد کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، قانونی بھی اور اخلاقی بھی، معاشی حالت کا ٹھیک کرنا بھی اس میں داخل ہے اور نفسیاتی طور پر اسے یہ یقین دلانا بھی اس میں آتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں یکّہ وتنہا نہیں ہے۔ اس پر ظلم ہو تو اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی اور مشکلات میں اس کا ساتھ دیا جائے گا، جس سوسائٹی میں مظلوم کی خدمت اور نصرت کا یہ عزم اور حوصلہ ہو وہ وحشت و بربریت سے پاک ہوگی اور اس میں کم زور سے کم زور انسان بھی بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوگا۔

رفاہی خدمات

ایک فرد اپنی جن ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح کی ضرورتیں معاشرہ میں بہت سے افراد کو لاحق ہوسکتی ہیں۔ رفاہی خدمات ان سب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے انجام دی جاتی ہیں۔ یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بعض خدمات معاشرہ کی عام ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ ان کا فائدہ کل آبادی یا اس کے بڑے حصے کو براہِ راست پہنچتا ہے۔ بعض خدمات وہ ہیں جو معاشرہ کی خاص خاص ضرورتیں پوری کرتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر ان سے بھی پوری سوسائٹی کو نفع پہنچتا ہے۔ اسلام نے دونوں قسم کی خدمات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

رفاہی خدمات افراد بھی انجام دیتے ہیں اور ادارے بھی۔ بہت سی خدمات فلاحی ریاست کی ذمے داریوں میں شامل ہیں۔ وہ اپنے وسائل کا بڑا حصہ ان پر صرف کرتی ہے۔ یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ ان کے حدود کیا ہیں؟ کہاں ایک کا دائرۂ عمل ختم ہوتا اور دوسرے کا شروع ہوتا ہے؟ ظاہر ہے وسائل و ذرائع کے لحاظ سے ان کا دائرۂ کار چھوٹا یا بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ ان سب کے درمیان اشتراک و تعاون بھی ہوسکتا ہے اور ہونا ہی چاہیے۔ اس سے بہتر اور مفید نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اسلام اپنے تمام احکام میں اصلاً فرد ہی کو خطاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ادارے ہوں یا حکومت، سب کی بنیاد فرد ہی ہے۔ وہی ان کی ہیئت کی تشکیل کرتا اور ان کے مزاج کو بناتا ہے۔ اس معاملے میں بھی اس نے سب سے پہلے فرد ہی سے خطاب کیا ہے۔

پاکی صفائی کی تعلیم اور انتظام

رفاہی خدمات میں ایک خدمت یہ بھی ہے کہ لوگوں میں پاکی صفائی کا شعور بیدار کیا جائے، اس کی ضرورت اور اہمیت ذہن نشین کرائی جائے، گندگی اور غلاظت کے نقصانات واضح کیے جائیں اور اس سے نفرت پیدا کی جائے۔ چھوٹی بڑی آبادیوں میں صفائی کا اہتمام کیا جائے، اس سلسلے کے مسائل حل کیے جائیں اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ لوگ گندگی میں رہنے پر مجبور نہ ہوں۔ ان سب باتوں کو مغرب کی دین سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس معاملے میں اسلام نے مثالی کردار ادا کیا ہے۔ وہ گندگی سے نفرت اور پاکی صفائی سے محبت کا جذبہ ابھارتا ہے۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت اور ترغیب وتشویق سے کام لیتا ہے۔ وہ نظافت و نفاست کا اعلیٰ ترین تصور دیتا اور اس کے مطابق پورے معاشرہ کو تیار کرتا ہے[1]

راستہ سے رکاوٹ دور کرنا

کسی ملک کی معاشی اور مادی ترقی میں آمد و رفت کے ذرائع کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ جہاں راستے صاف ستھرے اور محفوظ و مامون ہوں، سفر کی دشواریاں کم سے کم تر ہوں، زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسانیاں پائی جائیں، وہاں ترقی کے مواقع بھی اسی تناسب سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی مقصد کے لیے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر ہوتی ہے، پر خطر راستوں کو سفر کے قابل بنایا جاتا ہے، نشاناتِ راہ لگائے جاتے ہیں، ٹریفک کے قواعد وضوابط وضع کیے جاتے ہیں، سفر کو حادثات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسافروں کو سہولت اور آرام پہنچایا جاتا ہے۔ موجودہ دور نے فضائی سفر کی راہیں کھول دی ہیں۔ اس کے اپنی نوعیت کے مسائل ہیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش بھی مسلسل ہو رہی ہے۔

راستہ کی بڑی بڑی دشواریوں کو دور کرنا اور سفر کو آسان بنانا دراصل ریاست کی ایک بنیادی ذمے داری ہے۔ دنیا کی ہر فلاحی ریاست اس ذمے داری کو قبول کرتی ہے،

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' باب 'طہارت و نظافت'

لیکن اس میں افراد کا تعاون بہت ضروری ہے۔ جہاں افراد باشعور اور تربیت یافتہ ہوں، ان کے اندر خوفِ خدا اور انسانوں کی خیر خواہی اور ہم دردی کا جذبہ ہو، وہاں یہ کام آسان ہوتا ہے۔ ورنہ ہزار تدبیروں کے باوجود سفر دشواریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قدم قدم پر زحمتیں اور رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں۔ بسا اوقات مسافر سنگین حادثات سے دوچار ہوسکتا ہے۔ ان سب باتوں کے تجربات رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

اس طرح کی رفاہی خدمات کی ذمے داری اسلام کے نزدیک بھی ریاست ہی پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس میں فرد کو اس نے شریک کیا ہے اور اس کے کردار کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس نے فرد کو جن رفاہی خدمات کی صریح اور واضح الفاظ میں تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ راستوں کو صاف رکھے اور ان پر جو رکاوٹیں ہوں انھیں دور کرے۔ اس سلسلے کی بعض روایات یہاں پیش کی جارہی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الایمان بضع و سبعون او بضع و ستون شعبة فافضلها قول لا اله الا الله و ادناهـــا اماطـة الاذى عن الطريق والحياء شعبة من الايمان[1]	ایمان کی ستر سے اوپر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں ان میں افضل اور برتر شاخ لا الٰہ الا اللہ کا قول ہے اور ادنیٰ شاخ راستہ سے تکلیف کو دور کرنا ہے۔ حیا بھی ایمان ہی کی ایک شاخ ہے۔

[1] یہ روایت صحیح مسلم کی ہے۔ (کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان) بخاری کے الفاظ میں بغیر کسی شک کے کہا گیا ہے۔ الایمان بضع وستون شعبة (کتاب الایمان، باب امور الایمان) یعنی ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں۔ مسلم کی ایک اور روایت میں بغیر شک کے الایمان بضع وسبعون شعبة کہا گیا ہے۔ یعنی ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں ہیں۔ یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں بھی ہے۔ بعض شارحین حدیث کے نزدیک امام بخاری کی روایت قابل ترجیح ہے۔ اس لیے کہ ساٹھ سے اوپر والی تعداد پر سب ہی روایتیں متفق ہیں۔ لیکن بعض دوسرے شارحین نے ستر سے اوپر والی روایت کو ترجیح دی ہے، اس لیے کہ اس میں جو اضافہ ہے وہ ثقہ راویوں کی طرف سے ہے۔ ان کا اضافہ ہمیشہ قبول کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو نووی، شرح مسلم: ۱/۴۷
حدیث میں ایمان کی ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو جمع کرنے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک اچھا سا خلاصہ حافظ ابن حجرؒ نے پیش کیا ہے۔ (فتح الباری: ۱/۴۰، ۴۱) غالباً حدیث کا منشا یہ ہے کہ دین کی تفصیلات کو ساٹھ، ستر سے زیادہ عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر امام بیہقی کی 'شعب الایمان' سب سے جامع کتاب ہے۔

خدا پر ایمان سے آدمی میں مخلوقِ خدا کو راحت پہنچانے کا جذبہ بیدار ہوتا ا
پروان چڑھتا ہے۔ ایمان اگر صحیح معنی میں دل میں جاگزیں ہو تو آدمی کی کوشش ہوگی کہ اد
کی ذات سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔ اسی کا ایک چھوٹا سا پہلو حدیث میر
بیان ہوا ہے۔ کوئی بھی صاحبِ ایمان راستے میں پتھر، کانٹے، کوڑا کرکٹ اور گندگی جیسی چیزیر
جن سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے، برداشت نہیں کرے گا، بلکہ وہ انھیں یقیناً ہٹا دے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لقد رأيت رجلا يتقلب في الجنة في شجرة قطعها من ظهر الطريق كانت توذي الناس[1]

میں نے ایک شخص کو جنت میں چلتے پھرتے دیکھا (جس کا خاص عمل یہ تھا کہ) اس نے راستے میں موجود ایک ایسا درخت کاٹ دیا تھا، جو لوگوں کو تکلیف دے رہا تھا۔

مطلب یہ کہ اس نے لوگوں کے راستے سے ایک تکلیف دہ چیز دور کی تو اس
کے لیے جنت کی راہ آسان ہوگئی اور کسی رکاوٹ کے بغیر جنت کے سبزہ زاروں میر
گھومنا اس کے لیے ممکن ہوگیا۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فاخّره فشكر الله فغفر له[2]

ایک شخص نے راستہ چلتے ہوئے ایک خاردار شاخ دیکھی۔ اس نے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرما دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

مرَّ رجل بغصن شجرة على ظهر الطريق فقال واللہ لا نُحيّنَّ هذا

ایک شخص راستہ سے گزر رہا تھا کہ اس نے اس کے بیچ میں درخت کی ایک بڑی سی شاخ

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق

[2] بخاری، کتاب المظالم، باب من اخذ الغصن وما یوذی الناس الخ، مسلم حوالہ سابق

عن المسلمین لا یوذیھم فادخل الجنة[1]

دیکھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ خدا کی قسم میں اسے مسلمانوں کے راستے سے ہٹا دوں گا تاکہ وہ انھیں اذیت نہ دے۔ اس پر اللہ نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔

اوپر کی حدیث میں اس شخص کو جنت کا مستحق قرار دیا گیا تھا، جس نے ایک ایسے درخت کو کاٹ دیا تھا، جس سے لوگوں کو راستے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن اس حدیث میں راستے سے صرف ایک شاخ کے ہٹانے پر اس کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی راہ سے چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دور کرنا اور ان کو معمولی سے معمولی فائدہ پہنچانا بھی انسان کو جنت جیسی ابدی نعمت کا حق دار بناتا ہے۔

حضرت ابو برزہ اسلمیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی۔

علِّمنی شیئًا انتفعُ بہٖ

آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے جس سے فائدہ اٹھا سکوں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اعزل الاذی عن طریق المسلمین[2]

مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دور کر دو۔

گو ان احادیث میں صرف راستہ کی تکلیف دور کرنے کا ذکر ہے، لیکن جیسا کہ امام نوویؒ نے لکھا ہے:

فیه التنبیه علی فضیلة کل ما نفع المسلمین و ازال عنھم ضررا[3]

اس میں مسلمانوں کو نفع پہنچانے اور ان کے ضرر اور نقصان کو دور کرنے والے ہر عمل کی فضیلت کی نشان دہی کی گئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ ہدایات مسلم معاشرہ کے پیش نظر دی گئی ہیں، اس لیے ان میں مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دور کرنے کا ذکر ہے۔ ورنہ یہ ایک عام حکم ہے۔ کسی بھی انسان کے راستے سے تکلیف کا دور کرنا کارِ ثواب ہے۔

۱۔ مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل ازالة الاذی عن الطریق

۲۔ مسلم، حوالہ سابق۔ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب اماطة الاذی عن الطریق

۳۔ شرح مسلم: ۳۲۸/۲

چناں چہ ان ہی روایات میں سے بعض میں 'الناس' کا لفظ آیا ہے[1] جو عام انسانوں کے
لیے ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

یمیط الاذیٰ عن الطریق صدقة[2]	آدمی راستے سے تکلیف دہ چیز دور کرتا ہے، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

راستہ سے تکلیف دہ چیز دور کرنے کا جو ثواب بیان ہوا ہے، اس حدیث سے اس کی توجیہ ہوتی ہے۔ صدقہ کا مقصد مصیبت میں کسی کی مدد کرنا اور اسے راحت اور آرام پہنچانا ہے۔ راستہ سے تکلیف دہ چیز دور کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسافر کو پریشانی نہ ہو اور وہ صحیح وسلامت آسانی کے ساتھ راستہ طے کرلے۔ اس لحاظ سے یہ اس پر ایک صدقہ ہے۔[3]

راستہ کی تکلیفیں اور رکاوٹیں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کو دور کرنا اور سفر آسان بنانا ایک دینی کام ہے اور مسلمان اس پر بہترین اجر و ثواب کی توقع کرسکتا ہے۔

سرائے اور ہوٹل تعمیر کرنا

اسی سے ملتی جلتی خدمت ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر ہے، جہاں مسافروں کو بہتر سہولتیں حاصل ہوں اور وطن سے دوری کی وجہ سے انھیں دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت سے اس کا اجر و ثواب اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے:

---

[1] مسلم، حوالۂ سابق۔ ابو برزہ اسلمیؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ امط الاذیٰ عن طریق الناس۔ الادب المفرد: ۱/۳۲۴

[2] بخاری، کتاب المظالم، باب اماطۃ الاذیٰ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ الخ

[3] فتح الباری: ۵/۷۰

اِنَّ مِمَّا یلحقُ المؤمنَ من عملہٖ و حسناتہٖ بعد موتہٖ علمًا علّمہ و نشرہ وَ ولدا صالحا ترکہ او مصحفا ورّثہ او مسجدا بناہ او بیتا لابن السبیل او نہرا اجراہ او صدقۃ اخرجھا من مالہ فی صحتہ و حیاتہٖ یلحقہ بعد موتہٖ[1]	مومن کے مرنے کے بعد بھی اس کے جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے پہنچتا رہتا ہے، ان میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں، وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا، نیک اولاد جو اس نے چھوڑی (کیوں کہ اس کو نیکی کی راہ پر لگانے میں اس کی کوششوں کا بھی دخل تھا) قرآن شریف جس کا اس نے اپنے بعد کسی کو وارث بنایا، یا مسجد جو اس نے بنوائی یا مسافروں کے لیے کوئی مکان جو اس نے تعمیر کرایا یا نہر جو اس نے کھدوائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا۔ اس کا ثواب اسے اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا۔

اس حدیث میں رفاہِ عام کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے اور انھیں صدقاتِ جاریہ کہا گیا ہے۔ ان میں مسافروں کے لیے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں پیسہ صرف کرنا بہترین صدقہ ہے۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

افضل الصدقات ظل فسطاط فی سبیل اللہ[2]	صدقات میں بہتر صدقہ یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں خیمہ کا سایہ فراہم کیا جائے۔

اس حدیث میں مجاہدوں کے لیے خیموں اور چھول داریوں کے انتظام کرنے کا ثواب بیان ہوا ہے، لیکن اس ذیل میں تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ اور حج و عمرہ جیسے دینی مقاصد کے لیے مراکز قائم کرنا اور عمارتیں بنانا بھی آ سکتا ہے۔

---

[1] ابن ماجہ، باب ثواب معلم الناس الخیر۔ قال المنذری رواہ ابن ماجہ باسناد حسن والبیہقی و رواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ بنحوہٖ۔ الترغیب والترھیب: ۱/۶۸

[2] ترمذی، فضائل الجہاد، باب ماجاء فی فضل الخدمۃ فی سبیل اللہ۔ مسند احمد: ۵/۲۷۰

پانی کا نظم کرنا

پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صاف پانی کی فراہمی اور ضرورت کے مطابق فراہمی بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے، اس کا اندازہ اوپر کی اس روایت سے ہوسکتا ہے، جس میں بندگانِ خدا کے لیے نہر کی تعمیر کو صدقۂ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ و خیرات کریں۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ سب سے اچھا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کنواں کھدوا دو۔ چناں چہ انھوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوا دیا۔[1]

نہر اور کنواں کھدوانا پانی کی فراہمی کی ایک شکل ہے، جو قدیم زمانے سے رائج ہے۔ موجودہ دور میں ٹیوب ویل اور نل لگائے جاتے ہیں۔ حوض اور ٹینک میں پانی جمع کر کے تقسیم کرنا بھی اس کی ایک صورت ہے۔ اس طرح پانی مہیا کرنے کی تمام اسکیمیں اس میں آسکتی ہیں اور وہ سب اجر و ثواب کی مستحق ہیں۔

زمین کو آباد کرنا

بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا اور اس میں مدد دینا بھی ایک رفاہی خدمت ہے۔ اس سے مجموعی طور پر پوری قوم اور پورے ملک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ حکومت خود بھی غیر آباد زمینوں کو آباد کر کے اس کی آمدنی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگا سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ انھیں آباد کرنا چاہیں انھیں اس کی اجازت دی جائے اور آسانیاں فراہم کی جائیں۔ اسلام نے اس بات کی ترغیب دی ہے اور اسے کارِ ثواب بتایا

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب فی فضل سقی الماء۔ نسائی، کتاب الوصایا، باب فضل الصدقۃ عن المیت۔ اس روایت کے راوی حضرت سعید بن مسیبؒ اور حسن بصریؒ کی حضرت سعد بن عبادہؓ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ اس لیے یہ روایت حدیث کی اصطلاح میں منقطع ہے۔

، کہ بنجر اور افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنایا جائے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ن احیٰی ارضا میتة فلـه فیها جرها وما اکلت العافیة نها فهو لـه صدقة[1]

جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا اسے اس کا اجر ملے گا۔ اس سے ضرورت مند مخلوق (انسان، جانور، پرندے وغیرہ) جو کچھ کھائے وہ سب اس کی طرف سے صدقہ ہے (اس کا اسے اجر ملے گا)۔

کسی افتادہ زمین کو آدمی اپنی محنت سے زرخیز بنائے تو اس کا فائدہ اصلاً اس کی
ت اور اس کے خاندان کو پہنچتا ہے، لیکن یہ محنت ایک جائز مقصد کے لیے وہ کرتا ہے
لیے وہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ اس سے خدا کی جو
ق بھی فائدہ اٹھاتی ہے وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا
، کہ اس محنت سے انسانوں کو اور پورے معاشرہ کو جو فائدہ پہنچے گا اس کا کتنا بڑا اجر ہوگا؟

موجودہ دور کی رفاہی حکومتیں بھی افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے میں
تیں فراہم کرتی ہیں۔ اسلام نے اس سے آگے یہ اقدام کیا کہ جو شخص اس طرح کی زمین
آباد کرے اس پر اسے مالکانہ حقوق دے دیے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ روایت کرتے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ن احیٰی ارضًا میتة فهی ـــه[2]

جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہے۔

یہی بات حضرت عمرؓ نے بھی فرمائی ہے۔[3]

اس سلسلے میں حسب ذیل ہدایات دی گئی ہیں، تاکہ فرد کے حقوق اور معاشرہ
، مفادات دونوں محفوظ رہیں اور کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

سند احمد: ۳/۳۲۷
ترمذی، کتاب الاحکام، باب ما ذکر فی احیاء الموات
موطا، کتاب الاقضیة، باب القضاء فی عمارة الموات و رواه البخاری تعلیقاً۔ کتاب الحرث
ارعہ، باب من احیٰی ارضا مواتاً۔

۱- کسی دوسرے کی زمین کو افتادہ قرار دے کر اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گ

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اعمر ارضا لیست لاحد فهو احق [1] — جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا، جس کا کوئی مالک نہیں ہے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی زمین کو آباد کرنے سے آدمی کا اس پر حق اسی وقت تسلیم کیا جائے گا جب کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو۔ حضرت سعید بن زیدؓ روایت زیادہ واضح ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

من احیٰی ارضًا میتة فهی لـه ولیس لعرق ظالم حق [2] — جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی ک ہے، البتہ ظالم رگ (ظلم سے کی ہوئی کھیتی) کا کوئی حق نہیں ہے۔

مطلب یہ کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا اس کا مالک ہوگا، لیکن اس بہا سے دوسرے کی زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں کاشت شروع کر دینا ناجائز ہے۔ یہ صر ظلم ہے اور ظلم کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے۔

اوپر کی اسی حدیث کے ذیل میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے زمین میں کھجور کے درخت لگوا لیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پیش تو آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ زمین اس کے مالک کی ہے اور جس کے درخت تھے اسے دیا کہ وہ ان درختوں کو کٹوا کر لے جائے۔ چناں چہ درخت کٹوا دیے گئے۔ [3]

اس سے فقہ کے اس جزئیہ کی تائید ہوتی ہے کہ کسی غیر آباد زمین کے مالک پتہ نہ چلے اور اسے آباد کر لیا جائے تو مالک کا پتہ چلنے پر زمین واپس کر دی جائے گی ا مالکِ زمین کا جو نقصان ہوا ہے۔ زمین کا آباد کرنے والا اس کی تلافی کرے گا۔ [4]

---

[1] بخاری، کتاب الحرث والمزارعہ، باب من احیٰی ارضاً مواتاً

[2] ابوداؤد، کتاب الخراج والفئ والامارۃ، باب احیاء الموات۔ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ما ذ فی احیاء الموات

[3] ابوداؤد، حوالہ سابق

[4] ہدایہ: ۴/۴۷۸

۲- فقہ حنفی کی رو سے افتادہ زمین وہ ہے جو آبادی سے دور ہو، جو زمین آبادی
ے قریب ہو، اس سے آبادی کے بہت سے مفادات وابستہ ہوتے ہیں، لہٰذا آبادکاری
ے احکام اس سے متعلق نہ ہوں گے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے لیے
لامی ریاست کے سربراہ یا امام کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، جو بھی شخص اسے آباد
رے اس کا حق اس پر تسلیم کیا جائے گا، لیکن امام ابوحنیفہؒ نے امام کی اجازت کو ضروری
ار دیا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جو زمین آبادی سے قریب ہو اس کے لیے تو امام
ی اجازت ضروری ہے، لیکن جو زمین دور ہو اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے[۱]

۳- کسی نے زمین پر حد بندی کرلی اور تین سال تک اسے آباد نہیں کیا تو
لامی ریاست اس سے زمین واپس لے لے گی اور دوسرے شخص کو دے دے گی۔ اس
یے کہ پہلے شخص کو زمین اس لیے دی گئی تھی تاکہ وہ اسے آباد کرے اور عشر و خراج کے
ریعے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ محض حد بندی کو زمین کی آبادکاری نہیں کہا جاسکتا[۲]

اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

من عطل ارضـا ثـلاث سنين لم يعمـرهـا فجــاء غيره فعمرها فهي لـه[۳]	جس نے زمین تین سال تک آباد کیے بغیر چھوڑے رکھی اور کسی دوسرے نے آکر اسے آباد کرلیا تو وہ اسی کی ہوگی۔

۴- آبادکاری کے مفہوم میں کاشت اور کھیتی بھی ہے اور مکان کی تعمیر بھی۔ فقہ
فی کی رو سے اس کے ابتدائی اقدامات بھی اس میں آتے ہیں[۴]

۵- افتادہ زمین کو آباد کرنے کا حق مسلمانوں کی طرح ذمیوں کو بھی حاصل
گا[۵]

---

۱ ملاحظہ ہو ہدایہ: ۱/۴۷۸۔ فتح الباری: ۵/۱۲ ۲ ہدایہ حوالہ سابق
۳ فتح الباری: ۵/۱۴ ۴ ہدایہ: ۴/۴۷۷
۵ ہدایہ: ۴/۴۷۷

غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے سلسلے مین اسلامی قانون میں بڑی تفصیلا
موجود ہیں۔ یہاں اس کے صرف بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

درخت لگانا

غذا، صحت اور تندرستی کے نقطۂ نظر سے درختوں کی اہمیت بہت واضح ہے۔ ا
سے صاف ستھری اور تازہ ہوا ملتی ہے، وہ ٹھنڈا اور فرحت بخش سایہ فراہم کرتے ہی
بہت سے درختوں کے پھولوں اور پتوں میں انسانوں اور جانوروں کی غذا اور علاج ہے
ان میں وہ درخت بھی ہیں جو عمدہ اور نفیس پھل پیدا کرتے ہیں جو بہترین غذائیت ۔
حامل ہیں اور جن کا کوئی بدل انسان کے پاس نہیں ہے۔ ان کی سوکھی لکڑی تعمیرات میر
کام آتی ہے، ایندھن میں استعمال ہوتی ہے اور بھی بہت سے فائدے اس سے اٹھا
جاتے ہیں۔

جنگلات کے فوائد اور ان کے اثرات سے بھی ہم سب واقف ہیں۔ ان سے
بارش بروقت ہوتی ہے، موسم میں مناسب اور خوش گوار تبدیلی آتی ہے، آلودگی اور کثافت
دور ہوتی ہے۔ وہ سیلاب کی روک تھام کا بھی ذریعہ ہیں۔ جنگلات کے اس کے علاوہ او
بھی بہت سے فوائد ہیں۔

زمین کی آباد کاری میں شجر کاری اور باغات کا تیار کرنا بھی آتا ہے۔ احادیث
میں بہ طور خاص اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔
حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما من مسلم یغرس غرسًا او یزرع زرعا فیاکل منہ طیر او انسان او بھیمة الا کان لہ بہ صدقة[1]	مسلمان جو پودا لگاتا یا کھیتی کرتا ہے اس سے پرندے، انسان یا جانور کچھ کھاتے ہیں تو یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الحرث والمزارعہ، باب فضل الزرع الخ

اسی مفہوم کی ایک روایت صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

ما من مسلم یغرس غرسًا الا کان ما اکل منه له صدقةٌ وماسرق منه له صدقةٌ وما اَکَلَ السبعُ فهو له صدقة وما اکلت الطیر فهو له صدقة ولا یرزؤه احدٌ الا کان له صدقةٌ [1]

مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو اس سے جو کچھ کھایا جاتا ہے وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ (یہاں تک کہ) جو اس سے چوری ہوجائے وہ (بھی) صدقہ ہے، جو جنگل کے درندے کھا جائیں وہ (بھی) صدقہ ہے، پرندے جو کھائیں وہ بھی صدقہ ہے۔ کوئی شخص اس میں سے کچھ لے لے تو وہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت انسؓ کی حدیث کے ذیل میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

و فی الحدیث فضل الغرس والزرع والحض علی عمارة الارض

اس حدیث میں درخت لگانے اور کھیتی کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور زمین کو آباد کرنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سے زرخیز زمین رکھنے اور اس میں قیام کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اس سے ان غلط قسم کے زاہدوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے، جو ان کاموں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بعض روایات سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ان کاموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ آدمی ان میں لگ کر دینی امور سے غافل ہوجائے [2]

حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من بنی بنیانًا فی غیر ظلم ولا اعتداء او غرس غرساً فی غیر ظلم

جس شخص نے کسی پر ظلم و زیادتی کے بغیر کوئی عمارت بنائی یا ظلم و زیادتی سے بچتے ہوئے

---

[1] مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعہ، باب فضل الغرس والزرع۔
[2] فتح الباری: ۵/۳

ولا اعتداء كان له اجر جار ما انتفع به من خلق الله تبارك و تعالىٰ[1]

کوئی درخت لگایا تو وہ اس کے لیے جاری رہنے والا اجر ہے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھائے۔

شجر کاری یا باغات تیار کرنے کا کام انسان اپنے ذاتی فائدے کے لیے بھی کرسکتا ہے۔ اس کا بھی ثواب ہے، لیکن اگر یہی کام عام انسانوں کے فائدے کے لیے ہوتو اس کا اجر وثواب بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ یہ صدقہ جاریہ کی ایک صورت ہے۔ یعنی آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس کے لگائے ہوئے درخت سے جب تک لوگ فائدہ اٹھائیں گے اسے ثواب ملتا رہے گا۔ مسلم کی جو روایت ابھی گزر چکی ہے، اس میں "الی یوم القیامۃ" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی قیامت تک اسے اس کا ثواب پہنچتا رہے گا۔ ایک درخت لگایا جائے تو اس سے بہت سے دوسرے درخت وجود میں آسکتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کی تھوڑی سی کھیتی مزید کھیتی کا سبب بن سکتی ہے۔ جب تک یہ باقی ہے ثواب جاری رہے گا اس لیے کہ خدا کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ یہ سلسلہ قیامت تک دراز ہوسکتا ہے[2]

ایک شخص نے دمشق میں حضرت ابودرداءؓ کو دیکھا کہ وہ درخت لگا رہے ہیں۔ عرض کیا کہ آپ صحابیٔ رسولؐ ہیں اور اس (دنیا داری) میں لگے ہوئے ہیں۔ حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا: اعتراض کرنے میں جلدی مت کرو (یہ تو ایک کارِ ثواب ہے، جس میں میں مصروف ہوں) میں نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سنا ہے:

من غرس غرساً لم ياكل منه آدمي ولا خلق من خلق الله الا كان له صدقة[3]

اگر کوئی شخص درخت لگائے اور اس کے پھل سے آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق فائدہ اٹھائے تو یہ اس کے حق میں ایک صدقہ ہے۔

---

[1] مسند احمد: ۳/۳۳۸

[2] نووی: شرح مسلم: ۲/۱۵

[3] مسند احمد: ۶/۴۴۴

ان احادیث میں جو فضیلت بیان ہوئی ہے اس میں، راستہ میں سایہ دار درختوں کا لگانا، رفاہِ عام کے لیے باغات تیار کرنا، پارک بنوانا اور جنگلات کا تحفظ اور ان کی دیکھ بھال بھی آسکتی ہے۔

مساجد کی تعمیر

مسجد اصلاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے۔ اس کی تعمیر براہِ راست عبادت میں تعاون ہے۔ لیکن دورِ اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں ـــ ان کی یہ حیثیت اب بہت کچھ بدل چکی ہے ـــ اس لیے رفاہی خدمات کے ذیل میں ان کا ذکر ضرور کیا جاسکتا ہے۔ مسجد کی تعمیر کا ثواب حضرت عثمانؓ کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من بنى مسجدا يبتغي به وجه الله بنى الله له مثله في الجنة[1]	رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے اللہ کی رضا کی طلب میں کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسی طرح کا (گھر) جنت میں بنائے گا۔

مدارس کا قیام

قوموں کی ذہنی اور فکری تعمیر میں تعلیم بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے کسی قوم میں جو رفاہی خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام نے اس اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کے فروغ کی پوری کوشش کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے علم کی توسیع و اشاعت کو ایک دینی فریضہ قرار دیا اور ہدایت فرمائی کہ جو شخص دین کا جتنا کچھ علم حاصل کرے، اسے دوسروں تک پہنچائے۔ موجودہ دور میں علم کے فروغ کا بڑا ذریعہ تعلیمی ادارے اور درس گاہیں ہیں۔ یہیں سے وہ افراد تیار ہوتے ہیں، جو علم و فن، تہذیب و تمدن اور معیشت و سیاست کے مختلف شعبوں کو چلاتے ہیں۔ رسول اللہؐ

۱؎ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من بنی مسجداً۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل بناء المساجد

کے دور میں اس طرح کے ادارے الگ سے تو نہیں تھے، البتہ مساجد سے علم کی روشنی چاروں طرف پھیلتی تھی۔ وہاں تعلیمی مجلسیں ہوتی تھیں، علمی حلقے قائم تھے اور درس و تدریس کا فرض انجام پاتا تھا[۱] بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جہاں خالص دینی علوم کے ساتھ ان کی روشنی میں وقت کے افکار و نظریات کی بھی تدریس ہوتی تھی۔ ان اداروں نے امت کے اندر بڑے بڑے نام ور مفکرین اور مجتہدین پیدا کیے۔

شفا خانوں کا قیام

اسلام سے پہلے عرب میں لوگ اپنا علاج خود کرتے یا کراتے تھے۔ یہ ایک لحاظ سے ہر شخص کا ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اس کا خاندانی مسئلہ تھا، جسے وہ اپنے تجربات اور وسائل کے لحاظ سے حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ عوامی شفا خانوں یا اسپتالوں کا وجود نہیں تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی عرصے تک یہی صورتِ حال رہی، لیکن اس نے خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا، اس کے نتیجے میں یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح کے شفا خانوں کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ رفیدہ نامی ایک صحابیہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے مسجد نبوی کے پاس ایک خیمہ لگا رکھا تھا، جس میں وہ محض ثواب کی خاطر جنگ میں زخمی ہونے والے ان افراد کی مرہم پٹی اور علاج کرتی تھیں، جن کی نگہ داشت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ جنگ خندق میں زخمی ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوم سے کہا کہ وہ انھیں اسی خیمے میں رکھیں تا کہ وہ قریب رہیں اور عیادت کرنے میں آپؐ کو آسانی ہو[۲]

---

[۱] اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ محمد عربیؐ کے علمی احسانات، مطبوعہ سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ جنوری-مارچ ۱۹۸۷ء

[۲] ابن ہشام: سیرۃ النبیؐ: ۳/ ۳۵۸۔ نیز ملاحظہ ہو فتح الباری: ۷/ ۲۹۰۔ حضرت سعد بن معاذؓ کا یہ واقعہ بخاری کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس سے وقتِ ضرورت دوا علاج کے لیے کیمپ لگانے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ شفا خانے اسی ضرورت کو چوں کہ مستقل طور پر پورا کرتے ہیں، اس لیے تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا ان کی تعمیر و ترقی میں بڑا حصہ رہا ہے۔

رفاہی کاموں کے لیے وقف کی فضیلت

رفاہی کاموں کے لیے زمین، جائداد اور اپنی قیمتی چیزوں کے وقف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ ان کاموں کو جاری رکھنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے اور وقف کرنے والے کے لیے صدقۂ جاریہ بھی۔ صدقۂ جاریہ سے متعلق بعض روایات اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ یہاں ایک اور حدیث پیش کی جا رہی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله[1]

جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، البتہ تین صورتیں ایسی ہیں، جن میں اس کے اعمال باقی رہتے ہیں اور اسے ثواب ملتا رہتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ صدقہ جاریہ، اس کا وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے۔

امام نوویؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

فضرب النبیؐ خیمة فی المسجد لیعوده من قریب۔ کتاب الصلوٰة، باب الخیمة فی المسجد (رسول اللہؐ نے مسجد نبویؐ میں حضرت سعد کے لیے خیمہ لگوایا تھا تاکہ قریب سے عیادت کر سکیں) رفیدہؓ کا یہ خیمہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور خدمت کے لیے تھا اور اسی میں حضرت سعدؓ رکھے گئے تھے، اس لیے راوی نے غالباً اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ خیمہ گویا ان کے لیے لگا تھا۔ بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں اسے بنو غفار کا خیمہ کہا گیا ہے۔ کتاب المغازی، باب مرجع النبیؐ من الاحزاب۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ رفیدہؓ کے شوہر کا تعلق بنو غفار سے ہو اس وجہ سے اسے بنو غفار کا خیمہ کہا گیا ہو۔ فتح الباری: ۷/۲۹۲

[1] مسلم، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته۔

الصدقة الجارية وهي الوقف[1] صدقۂ جاریہ سے مراد وقف ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

فيه دليل لصحة اصل الوقف و عظيم ثوابه[2] اس میں وقف کے صحیح ہونے اور اس کے ثوابِ عظیم کی دلیل موجود ہے۔

وقف کی مختلف شکلوں کا رسول اکرم ﷺ کے دور میں ثبوت ملتا ہے۔ ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱- اسلام نے فلاحی کاموں کا جو اجر و ثواب بیان کیا ہے اس کی طلب میں صحابۂ کرامؓ نے اپنی بہترین اور محبوب ترین چیزیں وقف کر دیں۔

حضرت عمرؓ کو بہ طور غنیمت خیبر میں ایک زمین ملی (بعض روایات میں اس کا نام ثمغ آتا ہے) وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خیبر میں جو زمین میرے حصے میں آئی ہے، اس سے نفیس اور قیمتی چیز مجھے کبھی نہیں ملی۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہو کہ اس کی بہتر صورت کیا ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا:

ان شئت حبست اصلها و تصدقت بها اگر تم پسند کرو تو اس کی اصل وقف کر دو اور اس کی آمدنی کو صدقہ کر دو۔

حضرت عمرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے اس طرح وقف کیا۔

انه لا يباع اصلها ولا يوهب ولا يورث، في الفقراء و القربى والرقاب و في سبيل الله والضيف وابن السبيل لا جناح على من اس کی اصل نہ تو فروخت کی جائے گی اور نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ کوئی اس کا وارث ہی ہوگا۔ اس کی آمدنی صدقہ ہوگی محتاجوں اور قرابت داروں پر (جو اس کے مستحق ہوں گے) غلاموں کے آزاد کرنے اور اللہ کے راستے (جہاد) میں۔ یہ مہمانوں اور مسافروں پر بھی خرچ ہوگی۔ جو

---

[1] شرح مسلم: ۲/۴۱

[2] حوالۂ سابق

ولیھا ان یاکل منھا بالمعروف او یطعم صدیقا غیر متمول فیہ[1]

شخص اس کی دیکھ بھال کرے وہ معروف کے مطابق اس کی آمدنی سے خود بھی کھا سکتا ہے اور دوستوں کو بھی کھلا سکتا ہے۔ البتہ اس سے دولت جمع نہیں کرے گا۔

اس حدیث سے وقف کے جو احکام نکلتے ہیں وہ اس وقت زیر بحث نہیں ہیں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے بھی وقف ہوتا تھا اور یہ وقف اسی نوعیت کا تھا۔

۲- مسلمانوں کی دینی اور اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بعض صحابہ نے اپنی مشترکہ جائیداد وقف کردی۔

رسول اکرمؐ نے مدینہ پہنچنے کے بعد جب مسجد (نبوی) کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اس کے لیے جس جگہ کا انتخاب فرمایا وہ بنونجار کی تھی۔ آپؐ نے ان کے ذمے داروں کو طلب فرمایا اور اس کی قیمت دریافت کی۔ ان لوگوں نے عرض کیا:

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا للہ[2]

ہمیں اس کی قیمت نہیں چاہیے خدا کی قسم ہم تو اس کی قیمت صرف اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں۔

اس طرح مسجد نبوی وقف کی زمین پر تعمیر ہوئی۔ اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جو چیز ایک سے زیادہ افراد کی ملکیت ہو ان سب کی مرضی سے وہ وقف کی جاسکتی ہے[3]

---

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب الوقف کیف یکتب۔ مسلم، کتاب الوصایا، باب الوقف

[2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب ہل تنبش قبور مشرکی الجاہلیۃ الخ۔ مسلم کتاب المساجد

[3] امام بخاری نے اپنی صحیح کی 'کتاب الوصایا' میں اس پر ان الفاظ میں باب باندھا ہے۔ اذا وقف جماعۃ ارضا مشاعاً فھو جائز یعنی اگر مشترکہ زمین اس کے مالک وقف کردیں تو یہ جائز ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے زمین کے مالکوں کو قیمت دے دی تھی اور یہ دس دینار تھی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ ثابت بھی ہوجائے تو امام بخاری کا استدلال بہرحال صحیح ہوگا۔ اس لیے کہ نبیؐ نے بنونجار کی پیشکش رد نہیں فرمائی تھی کہ اس کی ملکیت میں متعدد افراد شریک ہیں اور یہ وقف نہیں کی جاسکتی۔ فتح الباری: ۵/۲۵۸۔ ابن ہبیرہ نے لکھا ہے کہ اس بات پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ مشترکہ چیز وقف کی جاسکتی ہے۔ الافصاح عن معانی الصحاح: ۲/۵۲۔ اس موضوع پر فقہاء کے خیالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ نیل الاوطار: ۶/۱۳۳۔ ابن قدامہ، المغنی: ۵/۶۴۴، ۶۴۳۔

۳- رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی اجتماعی ضرورت یا رفاہی خدمت کی طرف توجہ دلائی اور وہ وقف کے ذریعے پوری کردی گئی۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد (مسجد نبوی) کی توسیع کے لیے فلاں زمین خرید کر وقف کردے تو اسے جنت میں اس سے بہتر زمین ملے گی۔ حضرت عثمانؓ نے یہ زمین اپنے پیسے سے خرید کر دے دی۔[1]

رسول اللہ ﷺ ہجرت کرکے جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں میٹھے پانی کا ایک ہی کنواں تھا، جسے بئر رومہ کہا جاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص اسے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردے اور اس میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہو جتنا ایک عام مسلمان کا ہوتا ہے تو اسے اس سے بہتر چیز جنت میں ملے گی۔ حضرت عثمانؓ نے اسے خرید کر وقف فرما دیا۔[2]

۴- میت کی طرف سے وقف کو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا تاکہ اس کا ثواب اسے برابر پہنچتا رہے۔ آپؐ کے دور میں اس پر عمل بھی ہوا۔ چناں چہ حضرت سعد بن عبادہؓ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میری والدہ (عمرہ بنتِ مسعودؓ) کا اچانک انتقال ہوگیا۔ اس وقت میں موجود نہیں تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انھیں اس کا ثواب ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا ہاں ضرور ملے گا۔ انھوں نے عرض کیا:

---

[1] ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عثمان۔ نسائی، کتاب الاحباس، باب وقف المساجد

[2] حوالۂ سابق۔ و رواہ البخاری تعلیقا، کتاب المزارعۃ، باب من رای صدقۃ الماء وھبتہ و وصیتہ جائزۃ۔ بئر رومہ ایک روایت کے مطابق رومۃ الغفاری کا تھا۔ ان کی طرف منسوب ہوکر وہ بئر رومہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام لے آئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے پینتیس ہزار درہم میں خرید کر اسے وقف کیا تھا۔ نووی: تہذیب الاسماء واللغات (القسم الثانی) ۱/۳۶۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ ایک کنویں یا چشمہ کا نام تھا۔ اس کا مالک بنو غفار کا ایک شخص تھا۔ وہ ایک مد (ایک چھوٹا پیمانہ) غلہ کے عوض ایک مشک پانی فروخت کرتا تھا۔ رسول اللہؐ نے اس سے کہا کہ تم مجھے یہ دے دو۔ جنت کا چشمہ تمھیں اس کے عوض میں ملے گا۔ اس نے عرض کیا کہ میرے بچوں کے گزر بسر کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کو اطلاع ملی تو انھوں نے مذکورہ بالا رقم میں اسے خرید کر وقف کر دیا۔ نیل الاوطار: ۶/۱۳۱

انی اشهدک ان حائطی المخراف صدقة علیها[1] — میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرا فلاں پھل دار باغ میری ماں کی طرف سے صدقہ ہے۔

رفاہِ عام کے کاموں کے لیے وقف کا رواج مسلمانوں میں ہر دور میں رہا ہے۔ اس سے ان کاموں کے جاری رکھنے میں بڑی مدد ملتی رہی ہے۔

رفاہی خدمات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات اوپر پیش کی گئی ہیں ان کی تکمیل بعض دوسری ہدایات سے ہوتی ہے۔

عوامی ملکیت کو نقصان نہ پہنچایا جائے

اسلام نے ایک طرف تو شجر کاری کی ترغیب دی ہے۔ دوسری طرف اس بات سے منع کیا ہے کہ کسی پھل دار یا سایہ دار درخت کو کاٹ دیا جائے۔ حضرت عبد اللہ بن حبشیؓ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

من قطع سدرة صوّب الله راسه فی النار — جس نے بیری کا کوئی درخت کاٹا اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

بیری کا درخت آدمی کی ملکیت ہو تو اسے کاٹ سکتا ہے اور ذاتی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہاں اس درخت کے کاٹنے پر وعید سنائی گئی ہے جو کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو اور جس سے عوام کا مفاد وابستہ ہو۔

---

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب اذا قال ارضی او بستانی للہ۔ بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے اپنی ماں کی نذر کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ وہ انتقال کر گئیں اور نذر پوری نہ کر سکیں۔ آپؐ نے فرمایا تم ان کی طرف سے نذر پوری کردو۔ کتاب الوصایا، باب ما یستحب لمن توفی الخ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے حضرت سعدؓ نے اپنی ماں کی نذر اور ان کی طرف سے صدقہ، دونوں ہی باتوں کے بارے میں آپ سے دریافت کیا ہو۔ اوپر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ماں کی طرف سے باغ کا صدقہ کیا تھا۔ نسائی میں ہے کہ انھوں نے آپ کے مشورے سے کنواں کھدوایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی ماں نے غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی۔ فتح الباری: ۵/۲۵۲، ۲۵۳۔ اس سلسلے کی روایات کے لیے دیکھی جائے۔ نسائی، کتاب الوصایا باب فضل الصدقۃ عن المیت۔

امام ابوداؤد نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ وہ اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

من قطع سدرة فی فلاة یستظل بها ابن السبیل و البهائم عبثا و ظلماً بغیر حق یکون له فیها صوب الله راسه فی النار[۱]

جو شخص بیری کا وہ درخت کاٹے جو میدان میں ہو، جس سے مسافر اور جانور سایہ حاصل کرتے ہوں۔ یہ کاٹنا بے وجہ اور ظلم و زیادتی سے ہو اور اس درخت پر اس کا کوئی حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

اس سے یہ استدلال غلط نہ ہوگا کہ عوامی ملکیت کی کسی چیز کو نقصان پہنچانا گناہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ یہ خدا کی مخلوق کو اذیت اور تکلیف پہنچانے اور اسے جو راحت اور آسائش پہنچ سکتی ہے اسے ختم کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔

وہ وسائل حیات جو سب کی ملکیت ہیں

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جو ذخائر موجود ہیں، اور جن کے پیدا کرنے میں کسی شخص کی محنت کا کوئی دخل نہیں ہے، وہ سب کے لیے ہیں اور سب ہی ان سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء و الکلأ و النار[۲]

تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں۔ پانی، چارہ اور آگ۔

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی قطع السدر۔ اس موضوع سے متعلق بعض اور روایات اور ان کے سیاق وسباق کے لیے ملاحظہ ہو۔ بیہقی: السنن الکبریٰ: ۶/ ۱۴۰، ۱۴۱

[۲] یہ حدیث ابوداؤد میں ایک مہاجر صحابی سے مروی ہے۔ نام کی صراحت نہیں ہے۔ (کتاب البیوع، باب فی منع الماء) البتہ ابن ماجہ میں یہی روایت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے آئی ہے۔ ابواب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔ ابوداؤد کی روایت صحیح ہے، لیکن ابن ماجہ کی روایت میں ضعف ہے۔

اس حدیث میں پانی سے قدرتی چشموں، دریاؤں، ندیوں اور تالابوں وغیرہ کا پانی مراد ہے۔ اسی طرح جانوروں کا وہ چارہ جو جنگلوں اور میدانوں میں پایا جاتا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کا سب کو حق حاصل ہے۔ آگ سے ایندھن میں کام آنے والی لکڑی اور آگ جلانے کا سامان چقماق وغیرہ مراد لیے گئے ہیں[1]

قومی اہمیت کے وسائل سب کے لیے ہیں

قومی اور ملکی اہمیت رکھنے والے وسائلِ حیات کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوں گے، بلکہ ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کے برابر کے مواقع حاصل ہوں گے۔ ابیض بن حمالؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مارب (یمن کا ایک حصہ) میں نمک کی جو کان ہے وہ انھیں عطا کردی جائے۔ آپ نے وہ کان انھیں دے دی۔ جب وہ واپس ہوئے تو ایک شخص (اقرع بن حابس) نے عرض کیا کہ آپ نے انھیں ایک ایسی کان عطا فرما دی جو پانی کے ذخیرہ کی طرح ہے۔ وہاں کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس پر آپ نے وہ کان ان سے واپس لے لی اور عوام کے فائدے کے لیے وقف کردی۔ (ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے انھیں اس کے عوض ایک زمین اور باغ عطا فرمایا)۔

ابیض بن حمالؓ نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ 'اراک' (جس کے پتے اونٹ کے چارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں) کے کسی علاقہ کو حد بندی کے ذریعے اپنی ملکیت میں لیا جاسکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جہاں اونٹوں کے قدم نہ پہنچیں (یعنی جو آبادی سے دور ہو)[2]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار: ۶/ ۴۹، ۵۰

[2] ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی القطائع۔ ابن ماجہ، ابواب الرہون، باب اقطاع الانہار والعیون۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بھی اس طرح کا کوئی اقدام نہیں کرے گی کہ جن وسائلِ حیات سے عام لوگوں کا مفاد وابستہ ہے ان پر کسی ایک یا چند افراد کا قبضہ ہو جائے اور دوسرے ان سے محروم رہیں۔

فقہا نے لکھا ہے کہ حاکمِ وقت ایسی کوئی چیز کسی ایک فرد کو نہیں دے گا، جس سے عام مسلمانوں کی ضروریات متعلق ہوں۔ جیسے نمک کی کانیں یا ایسے کنویں جن سے قرب و جوار کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں[۱]

یہاں نمک اور پانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ضرورت کی اور چیزیں بھی آسکتی ہیں۔ علامہ ابن ہبیرہ نے لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ نمک والی زمین یا جس چیز سے بھی عام مسلمانوں کی منفعت وابستہ ہے اس پر کسی مسلمان کا تنہا قبضہ کر لینا جائز نہیں ہے[۲]

ذاتی وسائلِ حیات میں بھی دوسروں کا حق ہے

قدرت کے خزانوں کو آدمی بعض اوقات اپنی ذاتی جدوجہد اور محنت سے بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی ضرورت کے لیے کنواں کھدوایا، نہر نکالی یا حوض اور ٹینک میں پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ اس سلسلے میں ہدایت یہ ہے کہ اس سے دوسرے حاجت مندوں کو محروم نہ رکھا جائے۔ ایک حدیث میں اس بات پر سخت وعید سنائی گئی ہے کہ آدمی کے پاس فاضل پانی ہو اور وہ ضرورت مندوں کو ان کے استعمال کی اجازت نہ دے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین قسم کے انسانوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ تو انھیں دیکھے گا اور نہ ان سے بات کرے گا بلکہ ان پر اس کا سخت عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

۱۔ ہدایہ: ۴/۴۷۸

۲۔ الافصاح عن معانی الصحاح: ۲/۵۱

رجل کان له فضل ماء بالطریق فمنعه من ابن السبیل[1]

وہ شخص جس کے پاس راستے میں (کنویں وغیرہ کی شکل میں) فاضل پانی تھا اور اس نے مسافر کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

فیقول الله الیوم امنعک کما منعت فضل ما لم تعمل یداک[2]

اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ آج میں تمھیں اپنے انعام سے اسی طرح محروم کردوں گا، جس طرح کہ تم نے اپنی زائد چیز کو، جس کے پیدا کرنے میں تمھاری کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا، دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اس بات کی کس قدر تاکید کرتا ہے کہ آدمی کو و وسائلِ حیات حاصل ہیں ان سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد دوسروں کی مروریات کا بھی خیال رکھے۔

بخاری، کتاب المزارعۃ، باب اثم من منع ابن السبیل من الماء۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ئریم اسبال الازار الخ

۔ بخاری، کتاب المزارعۃ، باب من رای ان صاحب الحوض الخ۔ آدمی کے پاس پانی کا ذخیرہ وتو اس کے لیے دوسروں کی حاجت کا پورا کرنا کس حد تک ضروری ہے؟ اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ فتح الباری: ۵/۲۱

خدمت خلق کے ادارے اور تنظیمیں

اداروں کی ضرورت اور اہمیت

انسان اس دنیا میں بعض بنیادی ضروریات اور فطری تقاضے لے کر پیدا ہوتا ہے، ان کے پورا کرنے میں اسے مختلف سطحوں پر خاندان، خیر خواہ افراد، رفاہی اداروں اور ریاست کا تعاون ملتا رہتا ہے۔ یہ تعاون بھرپور ہو تو اس کے وجود و بقا اور ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اس میں جس حد تک کمی ہو اس حد تک یہ امکانات کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک فرد کے ذاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بسا اوقات افراد اور اداروں کے تعاون میں کوئی بڑا فرق نہیں محسوس ہوتا، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک تعاون وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی، معاشی اور طبی اداروں کی خدمات کو لیجیے۔ ایک طالب علم تعلیم سے فارغ ہو جائے تو اسکول اور کالج کا کام ختم ہو جاتا ہے، بے روز گار کو روزگار مل جائے تو معاشی اداروں کی ذمے داری پوری ہو جاتی ہے، مریض کو ممکنہ طبی سہولتیں فراہم کرنے کے بعد ہاسپٹل اور شفا خانے اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ یہی کام کسی شخص کا خاندان یا اس کا کوئی خیر خواہ انجام دیتا ہے۔ لیکن اس پہلو سے اداروں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ ان کی خدمات پوری آبادی اور اس کے مختلف طبقات کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کے پیش نظر فردِ واحد کے مفاد کی جگہ پورے معاشرے کا مفاد ہوتا ہے۔ کسی شخص کو تعلیم دے کر سوسائٹی میں باعزت مقام تک پہنچانا

خاص اس شخص کی خدمت ہے، لیکن ایک اچھے اسکول کا چلانا جہاں بے شمار بچے علم و ہنر سے آراستہ ہوکر نکلیں ایک پوری نسل کی خدمت ہے۔ اسی طرح کسی بے روزگار کو روزگار پر لگا دینا ایک شخصی تعاون ہے، لیکن کسی ایسے ادارے کا قیام جس سے بہت سے بے روزگاروں کا مسئلہ حل ہو، ایک پورے طبقے کے ساتھ تعاون ہے۔ رفاہی ادارے کسی فرد کو نہیں بلکہ معاشرے کو بہ حیثیت مجموعی اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں دینی اور اصلاحی اداروں کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اہمیت ان خدمات سے کہیں زیادہ ہے، جو مادی مقاصد کی تکمیل کے لیے انجام دی جاتی ہیں۔

رفاہی اداروں کے ذریعے خدمتِ خلق کے کاموں کو مربوط اور منظّم کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان میں عدمِ توازن اور بے ترتیبی پیدا ہونے نہیں پاتی اور جو کوئی جس درجے میں خدمت کا مستحق ہے اس کی خدمت ہوتی رہتی ہے۔ رفاہی ادارے آج کی دنیا میں فلاح و بہبود کی جو مفید اور وسیع خدمات انجام دے رہے ہیں انھیں ہر شخص دیکھ رہا ہے اور وقتِ ضرورت فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں انسان کی ہر بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ادارے موجود ہیں۔ اس طرح کے اداروں کو قائم کرنا اور چلانا اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ ان سے اس کا ایک اہم مقصد پورا ہوتا ہے۔

منظّم جد و جہد کے فوائد

ہر دور میں ایسے افراد پائے گئے ہیں، جن کے ذریعے رفاہی خدمات انجام پاتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض غیر معمولی خدمات بھی ہیں، ان سے نوعِ انسانی کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے، لیکن ایک تو اس طرح کے افراد کی تعداد کسی بھی دور میں کچھ زیادہ نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ فرد کے پاس قوت و صلاحیت کا تھوڑا سا سرمایہ ہوتا ہے۔ وسیع پیمانے پر خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کام اس کی استطاعت سے باہر ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے افراد مل جل کر اور منظّم طریقے سے کوشش کریں۔ تنظیم کی خوبی یہ ہے کہ اس کا انحصار کسی فرد پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک سے زیادہ افراد کی صلاحیتوں اور ان کے

وسائل کو استعمال کرتی ہے، اس لیے اس کی طاقت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایسے کام اس کے امکان میں ہوتے ہیں جو فردِ واحد کے لیے ممکن نہیں ہوتے۔ جس مقصد کے حصول کو فرد دشوار سمجھتا ہے، تنظیم کے ذریعے وہ مقصد بہ آسانی حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر خدمتِ خلق کی منظّم جدوجہد کی جائے اور مل جل کر سماج کی فلاح و بہبود کے کام کیے جائیں تو ان کی افادیت کا دائرہ وسیع ہوگا اور جن کاموں کو اہمیت دینے کے باوجود کوئی فردِ واحد انجام نہیں دے پاتا، وہ انجام پاسکیں گے۔ بڑے بڑے رفاہی اداروں کو قائم کرنے، انھیں باقی رکھنے اور سلیقے سے چلانے میں ایک دو نہیں بہت سے افراد کی مسلسل اور ان تھک جدوجہد کا دخل ہوتا ہے۔ ان کے بغیر وہ وجود میں نہیں آسکتے اور وجود میں آ بھی جائیں تو اپنے مقاصد پورے نہیں کر سکتے۔

اسلام نے زکوٰۃ کا نظام ریاستی سطح پر قائم کیا ہے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ جو افراد نصاب کے مالک ہیں ان سے زکوٰۃ وصول کرے اور ان لوگوں کے درمیان تقسیم کرے، جو اس کے مستحق ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام خدمتِ خلق کے لیے منظّم جدوجہد کو پسند کرتا اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتا ہے۔

غیر مسلموں سے تعاون

انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کے کام میں غیر مسلم تنظیموں اور اداروں کے ساتھ تعاون میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے یہ اصولی تعلیم دی ہے:

وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○	نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔ (المائدۃ:۲)

رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی مضبوط سیاسی نظام نہیں تھا، جس کی وجہ سے ایک طرح کا سیاسی و سماجی انتشار پایا جاتا تھا اور لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ تھے۔ کم زور، طاقت والوں کی چیرہ دستی کا نشانہ بنتے رہتے۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے اور ان سے باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جنگ وجدال، خوں ریزی اور ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو جاتا۔ اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش مشکل ہی سے ہوتی۔ مکہ جیسے دار الامن اور مرکزی شہر کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال کو بعض درد مند لوگوں نے بدلنا چاہا، مشورہ کے لیے عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ظلم و زیادتی کو ہر قیمت پر روکا جائے گا۔ کسی بھی شخص پر چاہے وہ مکہ کا رہنے والا ہو یا باہر سے آیا ہو، ظلم ہونے نہ دیا جائے گا۔ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کی جائے گی اور اسے اس کا حق دلوایا جائے گا اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ بھی اس معاہدہ میں شریک تھے۔ یہ معاہدہ آپؐ کی بعثت سے پہلے ہوا تھا۔ لیکن بعثت کے بعد بھی آپؐ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

لقد شهدت فی دار عبد الله ابن جدعان حلفا ما احب ان لی به حمر النعم ولو ادعی به فی الاسلام لاجبت[1]

میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ (عرب کی سب سے بڑی دولت) مل جائیں تو بھی پسند نہیں ہے۔ اگر اسلام کے آنے کے بعد بھی مجھے اس کی دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔

ظلم و ناانصافی کے خاتمے، انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی خدمت کے لیے جو تنظیم کام کرتی ہے وہ معاشرہ کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ جو معاشرہ اس قیمتی سرمایہ سے خالی ہو وہ دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ اسلام اس کا محافظ ہے اور اس کو ترقی دینا چاہتا ہے۔

---

[1] ابن سعد، طبقات: ۱/۱۲۹۔ ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۱/۱۴۴، ۱۴۵

ریاست سے تعاون

خدمت خلق کا سب سے بڑا ادارہ ریاست ہے۔ افراد اور تنظیمیں ہزار طاقت ور ہی، لیکن ان کی طاقت بہرحال محدود ہوتی ہے۔ ان کو اتنے وسائل و ذرائع حاصل نہیں ہوتے کہ ہر پہلو سے معاشرے کی خدمت کرسکیں اور اس کی تمام مشکلات کو حل کردیں۔ ریاست غیر معمولی وسائل و ذرائع کی مالک ہوتی ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرسکتی ہے۔ اس لیے ایک فلاحی ریاست کی یہ قانونی اور اخلاقی ذمے داری سمجھی جاتی ہے کہ معاشرے کی تعمیر اس ڈھنگ سے کرے کہ اس کا کوئی بھی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور اسے وہ تمام سہولتیں اور مواقع حاصل ہوں، جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ریاست اپنی ذمے داری کو محسوس نہ کرے تو اس کا وجود بے معنی ہے۔ لیکن ریاست اتنی بڑی ذمے داری سے اسی وقت سبک دوش ہوسکتی ہے جب افراد اس کے ساتھ تعاون کریں۔ محض ریاست کی کوشش سے معاشرہ غربت، افلاس، جہالت، بے روزگاری اور مرض جیسی مصیبتوں سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد میں معاشرہ کو پستی سے نکالنے اور اوپر اٹھانے کا جذبہ پایا جائے۔ ریاست اور افراد کے اشتراک و تعاون ہی سے خدمت خلق کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ کام ہمیشہ ادھورا اور ناقص ہی رہے گا۔

غلط تصوّرات کی اصلاح

خدمت خلق کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔ یہ جذبہ جتنا قوی ہوگا معاشرے اور سماج
لو اتنا ہی فائدہ پہنچے گا، لیکن اس کے بارے میں بعض غلط تصورات پائے جاتے ہیں۔
سلام نے ان کی اصلاح کی ہے اور صحیح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس معاملے میں بعض
بے اعتدالیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اسلام نے ان کو رفع کیا ہے اور اعتدال کی راہ دکھائی
ہے۔ یہاں اس کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

نسان پر مختلف حقوق عائد ہوتے ہیں

کوئی بھی فرد معاشرے میں بالکل الگ تھلگ زندگی نہیں گزارتا، بلکہ بے شمار
راد سے اس کے روابط ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی ذمے داریاں اٹھاتے ہیں اور کچھ
لی ذمے داریاں وہ اٹھاتا ہے۔ بعض افراد پر اس کے حقوق ہوتے ہیں اور بعض دوسرے
راد کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان حقوق اور ذمے داریوں کا دائرہ دور و نزدیک
کے بہت سے افراد تک وسیع ہوتا ہے۔ ان کے ادا کرنے میں کوتاہی پورے سماج کو
تاثر کرتی ہے۔

نقوق میں ایک فطری ترتیب ہے

کسی معاشرے میں انسان پر جو حقوق اور ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ان
ن ایک فطری ترتیب ہے۔ ان میں سب سے پہلے تو خود اس کی ذات کا حق ہے، پھر

ماں باپ، بیوی بچوں اور قرابت داروں کے حقوق ہیں۔ ان کے بعد ہی دوسروں کے حقوق آتے ہیں۔ اسلام نے اسی ترتیب سے حقوق عائد کیے ہیں۔ انسان اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دے سکتا ہے، اسی طرح اس کے قرابت دار اپنے حق سے دست بردار ہوسکتے یا اس میں کمی کرسکتے ہیں، لیکن خود اس کے لیے ان پر دوسروں کو ترجیح دینا صحیح نہیں ہے۔ جن افراد کا حق مقدم ہے وہ مقدم ہی رہے گا۔ اسے آدمی موخر یا نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اسلام نے حقوق کی جو ترتیب رکھی ہے اسے ایک حدیث کی روشنی میں آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی وابدء بمن تعول[1]

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی اپنی ضروریات سے بے نیاز ہونے کے بعد کرے۔ پہلے ان لوگوں پر صدقہ کرو جن کے اخراجات کے تم ذمے دار ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی ایک اور روایت اسے بالکل کھول دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

امر النبی ﷺ بالصدقۃ فقال رجل یا رسول اللہ عندی دینار قال تصدق بہٖ علی نفسک قال عندی اٰخر قال تصدق بہٖ علی ولدک قال عندی اٰخر قال تصدق بہٖ علی زوجتک قال عندی اٰخر قال تصدق بہٖ علی خادمک قال عندی اٰخر قال انت ابصر[2]

رسول اللہؐ نے (ایک مرتبہ) حکم دیا کہ صدقہ اور انفاق کیا جائے۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنے اوپر صدقہ (خرچ) کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنے بچہ پر خرچ کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنی بیوی پر خرچ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنے خادم پر خرچ کرو۔ اس نے عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے آپؐ نے فرمایا تم خود زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو (کہ اسے کہاں خرچ کرنا چاہیے)۔

---

[1] بخاری: کتاب الزکوٰۃ، باب لا صدقۃ الا عن ظھر غنی الخ تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری: ۱۹۰/۳

[2] ابوداؤد: کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم۔ نسائی: کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ عن ظھر غنی۔

قرابت داروں کا حق مقدم ہے

آدمی بعض اوقات اپنے مخصوص مزاج یا ذاتی رنجش اور خاندانی مخاصمت کی وجہ سے قرابت داروں کا حق فراموش کر دیتا ہے۔ وہ اپنوں کے ساتھ تو ہم دردی اور حسنِ سلوک کا روادار نہیں ہوتا، لیکن غیروں کے ساتھ قدم قدم پر دل جوئی، محبت اور ایثار و سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ خونی رشتہ داروں اور قرابت داروں سے غفلت اور بے توجہی برتتے ہوئے دنیا بھر کے رفاہی کاموں سے اس کی دلچسپی جاری رہتی ہے۔ یہ ایک غیر فطری طرزِ عمل ہے۔ اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کے بہت سے کاموں میں انفاق کا حکم دیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ثواب اہل خاندان اور متعلقین پر انفاق کا ہے۔ اس کی فضیلت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینار انفقتہ فی سبیل اللہ و دینار انفقتہ فی رقبۃ و دینار تصدقت بہ علی مسکین و دینار انفقتہ علی اھلک اعظمھا اجرا الذی انفقتہ علی اھلک[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو دینار تم نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا، اسی طرح جو دینار تم نے غلام کو آزاد کرنے میں صرف کیا یا جو دینار تم نے کسی مسکین پر خرچ کیا اور جو دینار تم نے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا ان میں زیادہ اجر و ثواب اس دینار کا ہے جو تم نے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا۔

محتاجوں کے حقوق نظر انداز نہ ہوں

انسان کو اپنی ذات اور اپنے قریب کے افراد سے محبت ہوتی ہے اس لیے ان کے حقوق ذرا کم ہی ضائع ہوتے ہیں، لیکن یہی محبت بسا اوقات وسیع دائرے میں خدمتِ خلق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آدمی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ جس طرح اس پر اس کی ذات اور اس کے قرابت داروں کا حق ہے، اسی طرح معاشرے کے

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک الخ

مسکینوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کا بھی حق ہے۔ اسے ان کی ضروریات کا احساس نہیں ہوتا، ان کی مشکلات سے ہم دردی نہیں ہوتی، وہ ان کے حقوق سے نگاہیں پھیر کر صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کو دیکھنے لگتا ہے اور ان کی خوشی اور راحت کے لیے بے شمار افراد کے حقوق پر شب خون مارتا اور انھیں نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ ظلم ہے اور پورے معاشرہ کے ساتھ بدخواہی ہے۔ معاشرہ کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر ایک کا حق ادا کرے اور کسی کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسلام نے جہاں اس بات کی تاکید کی ہے کہ انسان اپنے اور اپنے متعلقین کے حقوق ادا کرے، وہیں اس کا بھی حکم دیا ہے کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے، جس سے معاشرہ کے کسی بھی فرد کو کوئی نقصان پہنچے، بلکہ ہر ایک کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔ جس معاشرہ میں کم زور کے حقوق محفوظ نہ ہوں، اسے تباہی سے ہم کنار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ لا یقدس امۃ لا یؤخذ للضعیف فیھم حقہ[1]

بے شک اللہ اس قوم کو پاک اور بری نہیں قرار دے گا، جس میں کم زور کو اس کا حق نہ دیا جائے۔

انسان اپنی ذات اور خاندان کی محبت میں کسی حد پر نہیں رکتا۔ وہ خود بھی عیش و عشرت کی زندگی گزارنا چاہتا ہے اور اپنے متعلقین کے لیے بھی عیش و تنعم کی زندگی فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں دوسرے مستحقین کو نقصان پہنچائے بغیر کامیاب ہونا دشوار ہے۔ اسلام کی رو سے انسان اپنی اور اپنے متعلقین کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا ذمے دار ہے۔ اس کے بعد معاشرہ کے دیگر افراد کے حقوق شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ نیکی کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ ان سے کہو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو وہ خرچ کرو۔ (البقرۃ:۲۱۹)

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع، فی العطایا والھدایا، بحوالہ شرح السنۃ

امورِ خیر میں جو مال خرچ کر دینا چاہیے اس کے لیے آیت میں 'عفو' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ مال جو اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات سے زیادہ ہو[1] اس سے آگے ضروریات کی تعیین نہیں کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ افراد اور حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ آدمی خود ہی اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ کون سی چیز اس کی ضروریات میں شامل ہے اور کون سی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط نہیں ہے کہ آدمی اپنی اور متعلقین کی آسائش اور راحت کا خیال رکھے اور ان کے مستقبل کی فکر کرے، البتہ اسلام اس بات کا روا دار نہیں ہے کہ آدمی اپنی آسودگی اور خوش حالی کی دھن میں معاشرہ کے مصیبت زدوں اور فاقہ کشوں کو فراموش کر بیٹھے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان پر سب سے پہلے اپنے قریب ترین افراد کے حقوق عائد ہوتے ہیں لیکن ان حقوق کو ادا کر کے وہ ان ذمے داریوں سے سبک دوش نہیں ہوسکتا جو معاشرہ کے فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر آتی ہیں۔ کسی معاشرہ کا بہترین فرد وہی ہے، جو ان دونوں قسم کی ذمے داریوں کو ہر دم سامنے رکھے اور انھیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ اسلام اسی کے لیے تیار کرتا ہے۔

امیر وغریب کی مستقل تقسیم نہیں ہے

اسلام کم زوروں، ناداروں اور معاشرے کے محروم افراد کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا بڑی تاکید کے ساتھ حکم دیتا ہے، لیکن راہبانہ مذاہب یا بعض غیر معتدل معاشی نظریات کی طرح وہ سماج کو دو مستقل طبقات میں تقسیم نہیں کرتا کہ ایک طبقہ تو معاشی لحاظ سے مستحکم ہو اور اسے ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں اور دوسرا طبقہ اپنی

---

[1] 'عفو' کی تشریح میں متعدد اقوال ملتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے ما یفضل عن اھلک (جو تمھارے اہل و عیال کی ضرورت سے بچ جائے) یہی تفسیر بعض اور صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے۔ اس کی تائید مرفوع احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو، ابن کثیر، تفسیر: ۱/۲۵۶

بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی اس کا مستقل محتاج اور دست نگر رہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے کا ہر فرد معاشی طور پر خود کفیل ہو، اسے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا پڑے، اس کے لیے وہ جدوجہد اور محنت کرے اور اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کی تکمیل کے لیے جائز حدود میں کوشش کرے۔ یہ سب چیزیں اس کے نزدیک اجر و ثواب کی موجب ہیں۔ اس کے ساتھ معاشرے کے جو افراد صاحبِ حیثیت ہیں، جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہے اور جو دوسروں کی مدد کرسکتے ہیں انھیں وہ حکم دیتا ہے کہ کم زوروں کی مدد کریں، ان کے دکھ درد میں کام آئیں اور انھیں معاشی لحاظ سے مستحکم ہونے میں مدد دیں۔ اس سلسلے میں وہ ریاست کو بھی اس بات کا پابند بناتا ہے کہ جو افراد معاشی لحاظ سے کم زور ہوں ان کا تعاون کرے اور جو معاشی جدوجہد بالکل نہیں کرسکتے، ان کی کفالت کرے اور ان کی ضروریات کا بوجھ اٹھائے۔ یہ دراصل اس کے نزدیک معاشرے کو اوپر اٹھانے اور خود کفیل بنانے کی تدبیر ہے۔

اسے آپ اس حقیقت سے سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے زکوٰۃ کی حسبِ ذیل مدّات بیان کی ہیں:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ (التوبۃ:۶۰)	صدقات تو ہیں صرف محتاجوں اور مسکینوں اور ان کارکنوں کے لیے جو زکوٰۃ وصول کرنے پر متعین ہیں اور ان لوگوں کے لیے جن کی دل جوئی کرنا مقصود ہے اور غلاموں کو آزاد ہونے میں مدد دینے کے لیے اور قرض داروں کا قرض ادا کرنے کے لیے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لیے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

معاشرے میں جو افراد صاحب حیثیت اور متعین نصاب کے مالک ہیں، اسلام نے انھیں زکوٰۃ نکالنے اور ان متعین مدات میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن اس نے ایسا کوئی نظم نہیں قائم کیا ہے کہ یہ کل مدّات لازماً باقی رہیں اور مستحقین کا ایک گروہ

دوسروں کی مدد سے پرورش پاتا رہے۔ ایک طبقہ زکوٰۃ دینے والا اور ایک طبقہ زکوٰۃ لینے والا معاشرہ میں برقرار رہے۔

اس کی بعض تفصیلات میں علماء کے درمیان اختلاف ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی جگہ حاجت نہ ہو تو جہاں حاجت ہو وہاں زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے۔[1]

اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے صدقات و خیرات پر پلنے والا کوئی گروہ نہیں تیار کیا ہے، بلکہ جو افراد معاشی لحاظ سے کم زور ہیں اور جن کی معاش کا کوئی نظم نہیں ہے، اس سے ان کی معاش کا بندوبست کیا ہے۔

شخصی اور سماجی ضروریات کے لیے مدد طلب کی جاسکتی ہے

اسلام نے دوسروں کے سامنے اپنی ضروریات کے رکھنے اور دستِ سوال دراز کرنے سے منع فرمایا ہے، لیکن بعض نازک حالات میں احتیاج کو بیان کرنے اور مدد طلب کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔ حضرت قبیصہ بن مخارقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اوپر ایک مالی ذمے داری لی تھی۔ رسول اللہ ﷺ سے میں نے مدد کی درخواست کی آپؐ نے فرمایا: یہیں مدینے میں قیام کرو، صدقہ کا مال آئے گا تو تمھاری ضرورت پوری کردی جائے گی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

یا قبیصة ان المسألة لا تحل الا لاحد ثلاثةٍ رجل تحمّل حمّالةً حلّت له المسئلة حتی یصیبها ثم یمسک و رجل اصابته جائحةٌ اجتاحت ماله حتی یصیب قوامًا

اے قبیصہ! سوال جائز نہیں سوائے اس شخص کے جو تین طرح کے افراد میں سے ایک ہو۔ ایک وہ شخص جس نے دوسروں کی خاطر اپنے اوپر قرض کا بوجھ اٹھایا ہو، قرض کی رقم فراہم ہونے تک وہ سوال کرسکتا ہے پھر اسے رک جانا چاہیے۔ دوسرا وہ شخص جس کا مال کسی حادثہ میں ختم ہوجائے اس

---

[1] ابن، ہبیرہ، الافصاح: ۱/ ۲۲۸

من عیش او قال سدادا من عیش و رجل اصابته فاقة حتی یقوم ثلاثة من ذوی الحجی من قومه لقد اصابت فلانا فاقة فحلت له المسئلة حتی یصیب قواماً من عیش او سدادا من عیش فما سواهن من المسئلة یا قبیصة سحتاً یا کلها صاحبهما سحتا[1]

کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے اور وہ کھڑا ہوجائے یا آپ نے یہ فرمایا کہ یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہوجائے۔ تیسرا وہ شخص جسے فاقہ لاحق ہو اور اس کی قوم کے تین آدمی یقین کے ساتھ کہیں کہ فلاں شخص فاقہ میں مبتلا ہے اس کے لیے بھی سوال جائز ہے۔ یہاں تک کہ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے یا یہ فرمایا کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ ان تین صورتوں کے علاوہ اے قبیصہ! سوال کی جتنی صورتیں ہیں سب حرام ہیں۔ ان کے ذریعے کھانے والا حرام کھاتا ہے۔

اس میں تین قسم کے آدمیوں کو سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک وہ شخص جو لوگوں کے جھگڑوں اور نزاعات کو ختم کرنے اور متحارب گروہوں کے درمیان صلح صفائی کے لیے اپنے اوپر کوئی مالی ذمے داری لے لے۔ یہ ذمے داری وہ خود نہ ادا کرسکے تو دوسروں سے مدد لے سکتا ہے۔ یہ اس پر ایک قرض ہے اور اس قرض کے ادا کرنے میں معاشرہ کو مدد کرنی چاہیے۔[2]

افراد ہوں یا ادارے اور سوسائٹیاں آپس کے اختلافات ان کو تباہ کردیتے ہیں۔ ایک فریق ظلم کرتا ہے دوسرا اس کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ ایک اپنے حق سے زیادہ مطالبہ کرتا ہے دوسرا اس کے حق ہی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا یا اسے اس کے حق سے کم دینا چاہتا ہے۔ یہ اختلافات جب حد سے آگے بڑھتے ہیں تو جان و مال کے بڑے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ ان جھگڑوں کو بسا اوقات مالی تعاون کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے اور صلح صفائی ہوسکتی ہے۔ دولڑنے والے افراد یا فریقوں کے

۱۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب من تحل لہ المسئلۃ
۲۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو۔ خطابی، معالم السنن: ۲/ ۶۷، ۶۸

درمیان صلح کی خاطر مالی بوجھ برداشت کرنا خدمت خلق کی بہترین شکل ہے۔ یہ حدیث کہتی ہے کہ جو شخص اس خدمت کے لیے اٹھے، وہ اس تعاون کے لیے دوسروں کے سامنے دستِ سوال بھی دراز کر سکتا ہے۔ حکومت اور معاشرے کو اس میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

دوسرا شخص جس کو سوال کرنے کی اس حدیث میں اجازت دی گئی ہے وہ ہے جو کسی ارضی و سماوی مصیبت کی وجہ سے معاشی مشکلات میں گرفتار ہو جائے۔ بعض اوقات سیلاب، طوفان، زلزلہ، آتش اور لوٹ مار جیسی آفات سے ایک خوش حال آدمی بھی اچانک اپنی بنیادی ضروریات تک پوری کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسے اجازت دی گئی ہے کہ وہ دوسروں سے مدد طلب کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے۔

امام خطابی کہتے ہیں کہ کسی کا ساز و سامان سیلاب میں غرق ہو جائے یا آگ سے جل جائے یا اس کے غلے اور پھلوں کو پالا لگ جائے یا اسی طرح کی کسی دوسری آفت میں گرفتار ہو جائے تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے اور واجب ہے کہ لوگ اُسے صدقہ و خیرات دیں۔ اس شخص سے دلیل کا مطالبہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تباہی خود اس کے احتیاج کی دلیل ہے[1]

راوی حدیث کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے 'حتّٰی یصیب قواماً من عیش' ارشاد فرمایا یا 'سداداً من عیش' کے الفاظ استعمال فرمائے۔ لیکن یہ دونوں جملے ہم معنی ہیں[2] ان کا مطلب یہ ہے کہ اتنا سر و سامان ہو جائے کہ آدمی کی بنیادی ضرورتیں

---

[1] معالم السنن: ۲/۶۷

[2] امام نووی فرماتے ہیں۔ السداد والقوام وھما بمعنی وھو ما یغنی من شیء وما تسد بہ الحاجۃ۔ شرح مسلم: ۱/۳۳۴۔ علامہ ابن اثیر نے 'قواما من عیش' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ ای ما یقوم بحاجتہ الضروریۃ۔ قوام الشیء عمادہ الذی یقوم بہ۔ النہایہ فی غریب الحدیث: ۳/۲۸۵ 'سدادا من عیش' کی شرح میں فرماتے ہیں ای ما یکفی حاجتہ والسداد کل شیء سددت بہ خللا: ۲/۱۵۳

پوری ہوجائیں اور وہ بے نیاز ہوجائے۔ انسان کی زندگی کا دار و مدار جن امور پر ہوتا ہے انھیں 'قواماً من عیش' کہا گیا ہے۔ غربت کی وجہ سے زندگی میں جو رخنہ اور خلل پیدا ہو جاتا ہے ان کے پر کرنے کو 'سداداً مَن عیش' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں۔ اس کے لیے وہ مجبوری میں دوسروں سے سوال کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔

حدیث میں جس ناگہانی صورت کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی بھی شخص کے ساتھ کسی بھی وقت پیش آسکتی ہے۔ جو شخص اس صورتِ حال سے دو چار ہو کم از کم اس کی بنیادی ضرورتوں کے پورا کرنے کی ضرور کوشش ہونی چاہیے۔ یہ کوشش افراد کی طرف سے بھی ہونی چاہیے اور اداروں کی طرف سے بھی۔ اگر انسان کی ناگزیر ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں تو اس کے لیے اپنے نقصان کی تلافی کرنے اور اپنی سابقہ حالت کو بحال کرنے کی کوئی تدبیر کرنا آسان نہیں ہے۔ مزید ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے بارے میں تو اس کا ذہن شاید سوچنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوگا۔

تیسرا شخص جسے سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ ہے جو فقر و فاقہ پر مجبور ہوگیا ہو۔ اور اس کی مجبوری کی گواہی اس کے خاندان، محلّہ اور بستی کے لوگ دیں۔ فقر و فاقہ کے اسباب، بے روزگاری، کم آمدنی، صحت کی خرابی وغیرہ بہت سے ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی وجہ سے آدمی بھوک اور فاقہ کی لپیٹ میں آگیا ہے تو اسے دوسروں سے مانگنے کا حق ہے اور ان کا اخلاقی اور بعض حالات میں قانونی فرض ہے کہ اس کی مدد کریں اور اسے موت کے منہ میں جانے نہ دیں، لیکن ظاہر ہے جن اسباب کی وجہ سے وہ اس حالت میں ہے ان اسباب کا دور کرنا زیادہ اہم ہے، ورنہ جب تک یہ اسباب ختم نہ ہوں وہ مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتا رہے گا اور اس کا احتیاج ختم نہ ہوگا۔ اسلام کسی کو اس حال میں دیکھنا

نہیں چاہتا[1]

حدیث میں اس شخص کو بھی سوال کی اجازت دی گئی ہے جو قرض کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا ہو۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان المسألة لا تصح الا لثلاث لذی فقر مدقع او لذی غرم مفظع او لذی دم موجع[2]

سوال صرف تین طرح کے آدمیوں کے لیے جائز ہے۔ ایک وہ جسے فقرو احتیاج نے بالکل لٹا دیا ہو، دوسرا وہ جس پر قرض کا شدید بوجھ ہو، تیسرا وہ جس نے کسی کا خون بہایا ہو اور اس کی دیت کا مسئلہ اسے یا اس کے سرپرستوں کو پریشان کر رہا ہو۔

آدمی کبھی قرض میں اس بری طرح پھنس جاتا ہے کہ اس سے نکلنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس سے بسا اوقات آدمی کا سارا کاروبار ختم ہو جاتا ہے اور اس کے پاس کوئی ذریعہ معاش باقی نہیں رہتا۔ قرض کی وجہ سے چلتے ہوئے ادارے بند ہوجاتے ہیں اور بڑی بڑی کمپنیاں ڈوب جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں اس طرح کے افراد

جو شخص کسی ارضی و سماوی مصیبت میں گرفتار ہوجائے اس کے لیے حدیث میں گواہی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ اس کا نقصان بالکل واضح ہے۔ یہ خود اس کے غربت و افلاس کی دلیل ہے۔ لیکن اگر ایک خوش حال اور کھاتا پیتا شخص اپنے فقر و فاقہ اور افلاس کا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کا مال و اسباب راتوں رات ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے یا اس کی امانت کسی نے ہڑپ کرلی ہے یا کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے وہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوگیا ہے تو ضروری ہوگا کہ اس کے قریب کے تین سوجھ بوجھ والے اشخاص اس کی تصدیق کریں۔ اس کی نوعیت شہادت کی نہیں ہے ورنہ دو کی شہادت کافی ہوتی بلکہ یہ دراصل تحقیق حال اور تصدیق کی ایک صورت ہے۔ ملاحظہ ہو خطابی، معالم السنن: ۲/۶۷۔ یہ بات آپ نے غالباً سوال سے باز رکھنے کے لیے بھی فرمائی ہے تاکہ کوئی شخص فاقہ کے نام پر سائل نہ بن جائے۔ یہ سوال پر ایک طرح کی بندش ہے۔

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب ما تجوز فیہ المسئلہ۔ اس مفہوم کی روایتیں ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں بھی ہیں۔

اور اداروں کے ساتھ دو طرح کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کے دلوالیہ ہونے کا اعلان کر کے ان کا کاروبار ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس بے رحمی کے نتیجے میں خوش حال زندگی گزارنے والے خاندان کے خاندان غربت و افلاس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور ان کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔

دوسرا رویہ جو ہمدردی کا رویہ سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ اس مصیبت سے نکلنے اور ان کی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے انھیں مزید قرض دیا جائے۔ لیکن آج قرض کے ساتھ سود لازمی ہے۔ یہ بہ ظاہر ہم دردی بھی انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی ایک مکروہ شکل ہے۔ اس سے آدمی قرض در قرض اور سود در سود کے جال میں اس طرح پھنستا چلا جاتا ہے کہ اس سے کبھی نکل نہیں پاتا۔ اس سے نجات پانے کے لیے بعض اوقات وہ خود چاہنے لگتا ہے کہ اس کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا جائے اور اس کے کارخانوں اور فیکٹریوں پر تالے لگا دیے جائیں۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر کسی نے جائز مقصد اور جائز ذریعے سے قرض حاصل کیا ہے اور اس قرض کے ڈوبنے میں دانستہ اس کی کسی غلطی کا دخل نہیں ہے تو معاشرہ کا فرض ہے کہ اس پریشانی سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔ اس کے لیے وہ معاشرہ اور ریاست سے اپیل بھی کر سکتا ہے۔ زکوٰۃ میں بھی اس کے لیے ایک مد رکھی گئی ہے۔ جو شخص بھی ان دونوں رویوں کا مقابلہ کرے گا وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اسلام کا رویہ ہم دردی اور انسانیت کا ہے جب کہ موجودہ دور نے بے رحمی اور ظلم کا رویہ اختیار کیا ہے۔

خدمتِ خلق کل دین نہیں ہے

اسلام کی بنیاد، عقائد کے بعد اعمالِ صالحہ پر ہے، لیکن تمام اعمالِ صالحہ ایک ہی درجہ اور ایک ہی حیثیت کے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور بعض کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔ بعض ارکانِ دین ہیں، بعض ضروری اور بعض پسندیدہ

سمجھے گئے ہیں، بعض کو صرف جواز کا درجہ حاصل ہے۔ فقہ کی زبان میں اس فرق کو فرض، واجب، مندوب، مستحب اور مباح جیسی اصطلاحات میں بیان کیا جاتا ہے۔ اپنی اہمیت کے لحاظ سے اعمال کی جو ترتیب شریعت نے قائم کردی ہے اس کی پابندی بہت ضروری ہے، ورنہ پورا نظامِ شریعت درہم برہم ہوجائے گا۔

خدمتِ خلق کو، اس میں شک نہیں، شریعت نے بڑی اہمیت دی ہے، لیکن یہی کل دین یا اس کا حاصل نہیں ہے۔ بعض بزرگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدمت ہی ان کا دین اور مذہب تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے خدمتِ خلق کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہو، لیکن اس میں مبالغہ ضرور پایا جاتا ہے۔ اس سے دین کے دوسرے زیادہ اہم تقاضوں کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے یا ان کی طرف وہ توجہ نہیں ہو پاتی جو ہونی چاہیے اور خود ان بزرگوں کی زندگی کے کچھ اور نمایاں پہلو دب جاتے ہیں۔ اس طرح کا غیرمتوازن رویہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک خدمت ہی مذہب کی روح اور اس کی اصل غرض و غایت ہے۔ مشرکین مکہ میں بھی کچھ اسی طرح کا احساس پایا جاتا تھا۔ وہ کعبۃ اللہ کی دیکھ بھال کرتے تھے، حاجیوں کے لیے پانی کا نظم کرنے اور ان کی خدمت کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ انھیں ان خدمات پر بڑا ناز تھا اور اس کی وجہ سے وہ خود کو کعبۃ اللہ کی تولیت کا حق دار تصور کرتے تھے۔ اسلام کسی بھی معاملہ میں بے اعتدالی اور عدم توازن کو راہ پانے نہیں دیتا اور بساطِ زندگی میں جس عمل کی جو جگہ ہے اسے ٹھیک اسی جگہ رکھتا ہے۔ چناں چہ قرآن مجید نے مشرکین سے کہا کہ تمھاری یہ خدمات اللہ اور آخرت پر ایمان، نماز اور زکوٰۃ، دل کا خدا کے خوف کے علاوہ ہر خوف سے پاک ہونا، اس کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد، اس راہ میں جان و مال کی قربانی، ہجرت اور جہاد جیسے بلند و برتر اعمال کا مقابلہ ہرگز نہیں کرسکتیں۔ یہ خوبیاں جن میں ہیں وہی کعبۃ اللہ کے متولی ہوں گے۔ تم اس کے حق دار نہیں ہوسکتے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ○ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ (التوبۃ:۱۸-۲۲)

اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، جو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈریں، ان ہی سے یہ توقع ہے کہ ہدایت پائیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آباد کاری کو اس شخص کے عمل کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے۔ یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہوسکتے۔ اللہ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ انھیں ان کا رب اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضا مندی اور ایسی جنتوں کی خوش خبری دیتا ہے، جن میں ان کے لیے ہمیشہ کی نعمتیں ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے نزدیک بڑا اجر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کے بہت سے تقاضے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی جدوجہد کی جائے، لیکن اسے انجام دے کر کوئی شخص دین کے دوسرے تقاضوں سے سبک دوش نہیں ہو جاتا۔ دین اس سے جس وقت جس تقاضے کو پورا کرنے کا مطالبہ کرے اسے پورا کرنا ہوگا۔

اخلاص ضروری ہے

کسی بھی عمل کے لیے محرک کا سوال بہت اہم ہے۔ ایک ہی عمل کے پیچھے چھے محرکات بھی ہو سکتے ہیں اور غلط محرکات کے تحت بھی وہ انجام پاسکتا ہے۔ اسلام نے ل کے محرک کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک کسی عمل کا جائز اور درست ہونا ں کافی نہیں ہے بلکہ اس کے محرکات کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ صحیح محرک کو وہ 'اخلاص' سے تعبیر کرتا ہے اور غلط محرک کے لیے اس کے نزدیک ایک جامع لفظ 'ریا' ہے۔

ندمت اخلاص کے ساتھ ہو

خدمت خلق بہت بڑا کارِ خیر اور خدائے تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے۔ اس پر س اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا مستحق انسان اسی وقت ہوگا جب کہ وہ پورے غلاص کے ساتھ اسے انجام دے اور خدا کی رضا کے سوا کوئی دوسری غرض اس کے سامنے نہ ہو۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو انفاق کے ذیل میں وضاحت کے ساتھ بان کیا ہے۔ روپے پیسے اور مال کا خرچ کرنا انفاق ہے۔ خدمتِ خلق کے کاموں میں ذم قدم پر اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خدمتِ خلق کی راہ میں مال کا خرچ کرنا جس ذر دشوار ہے، اس میں اخلاص کا باقی رکھنا اس سے زیادہ دشوار ہے۔ اللہ کے جو بندے غلاص کے ساتھ اپنی دولت خرچ کرتے ہیں، قرآن مجید میں ان کی توصیف کی گئی اور

انھیں آخرت کی کام رانی کی بشارت دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَیۙ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَا لَهٗ یَتَزَكّٰیۚ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤیۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰیۚ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰیۙ (الّیل:۱۷-۲۱)

اور جہنم سے اس شخص کو دور رکھا جائے گا، جو خدا سے بہت ڈرنے والا ہے، جو اپنا مال اپنے نفس کے تزکیے کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان نہیں ہے کہ وہ اس کا بدلہ دے۔ وہ تو صرف اپنے ربِ اعلیٰ کی رضا چاہتا ہے اور بہت جلد وہ راضی ہو جائے گا۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکرؓ کے سلسلے میں نازل ہوئیں۔ مکہ کے ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے والوں، خاص طور پر غلاموں پر ناقابل برداشت زیادتیاں ہوتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ ان غلاموں کو خرید کر آزاد فرما دیتے تھے۔ ان میں حضرت بلالؓ بھی تھے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ پر کوئی احسان کیا ہو اور وہ ان کا بدلہ چکا رہے ہوں۔ ان آیات میں اس کی تردید اور حضرت ابوبکرؓ کے اخلاص کی تعریف کی گئی ہے[1]

حضرت ابوبکرؓ کے اس انفاق کو اسلام کی خدمت بھی کہا جاسکتا ہے اور اسے انسانوں کی خدمت کہنا بھی غلط نہ ہوگا، لیکن اس خدمت کو خدائے تعالیٰ کی خوش نودی کی سند اس وقت ملی جب کہ اس کے پیچھے صرف اس کی رضا کا جذبہ کارفرما اور موج زن تھا اور کسی بھی دوسرے محرک سے وہ پاک تھا۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان آیات میں جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ حضرت ابوبکرؓ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھے اور انھیں اس راہ میں سبقت کا شرف بھی حاصل ہے۔ لیکن آیات کے الفاظ عام ہیں اور پوری امت کے لیے ہیں[2] یعنی اس میں امت کا ہر وہ فرد آجائے گا جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔

---

[1] تفسیر بغوی اور خازن: ۶/۴۴۱، ۴۴۲

[2] تفسیر ابن کثیر: ۴/۵۲۱

خلاص سے انفاق کا اجر وثواب

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے لیے انفاق کا اجر وثواب ان الفاظ میں
ن ہوا ہے:

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرۃ:۲۶۵)

ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ کی رضا کی طلب میں اور اپنے آپ کو اس پر جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے بلندی پر کوئی باغ ہو اور اس پر تیز بارش ہو اور وہ دوگنا پھل لائے۔ تیز بارش نہ بھی ہو تو اس کے لیے ہلکی پھوار ہی کافی ہے، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

یہاں اللہ کی رضا کی طلب کے ساتھ 'تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ' کے الفاظ آئے ں۔ اس کے کئی ایک مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انفاق پر طبیعت کو جمائے کھتے ہیں یہاں تک کہ یہ جذبہ ان کے اندر رچ بس جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اخلاص و پوری طرح باقی اور اسے ہر کھوٹ سے پاک رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی کمی آنے نہیں یتے۔ تیسرے یہ کہ انھیں آخرت اور وہاں کے عذاب وثواب پر پورا یقین ہوتا ہے اور عذاب سے بچنے اور ثواب حاصل کرنے کے لیے اپنا مال لٹاتے رہتے ہیں۔[۱]

انفاق برملا اور سب کے سامنے کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے تاکہ سروں کو ترغیب ہو اور کارِ خیر میں وہ بھی آگے بڑھیں۔ وہ پوشیدہ طریقے سے اور چھپا کر ی کیا جاسکتا ہے، تاکہ لینے والے کی خودی مجروح نہ ہو اور وہ خفت نہ محسوس کرے۔ وقع و محل کے لحاظ سے دونوں صحیح ہیں، لیکن دونوں میں اخلاص شرط ہے۔ ارشاد ہے:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ

اگر تم اپنے صدقات کو علانیہ دو تو بھی اچھی بات ہے لیکن اگر تم ان کو پوشیدہ رکھو اور فقراء پر خرچ کرو

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو رازی، تفسیر کبیر، ج ۴، جزء ۷، ص ۴۹

خَيْرٌ لَّكُمْ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۝ (البقرۃ:۲۷۱)

تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تمھارے گناہوں کو معاف فرمائے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

پوشیدہ طریقہ سے انفاق میں ریاکاری کا امکان کم ہوتا ہے اس لیے اسے زیادہ بہتر کہا گیا ہے۔ جب تک کسی دینی و ملی مصلحت کا تقاضا نہ ہو، انفاق خفیہ طریقہ ہی سے ہونا چاہیے۔ احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

سبعة يظلهم الله تعالى فى ظله يوم لا ظل الا ظله

سات قسم کے انسان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا جب کہ اس کے سایے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔

ان سات قسم کے خوش بخت انسانوں میں، آپؐ نے فرمایا:

رجل تصدق بصدقة فاخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه[1]

وہ شخص بھی ہے جس نے صدقہ کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو اس کا پتہ نہ چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔

ریا سے اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے

'ریا' اخلاص کے لیے سمِ قاتل ہے۔ جہاں ریا موجود ہو وہاں اخلاص ختم ہو جاتا ہے۔ اخلاص سے قیامت کے روز اعمالِ خیر نتیجہ خیز ہوں گے اور ریاکاری انھیں بے ثمر بنادے گی۔ اخلاص خدائے تعالیٰ کی نوازشِ بے پایاں کا موجب ہوگا، اور ریاکاری اس کے غضب کو دعوت دے گی۔ اس لیے قرآن و حدیث میں اخلاص پر جتنا زور دیا گیا ہے اسی قدر 'ریا' سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ریاکاری سے اعمالِ خیر کس طرح بے نتیجہ ہو جاتے اور اپنا اجر و ثواب کھو بیٹھتے ہیں، قرآن مجید نے اسے یوں سمجھایا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ بالیمین۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ

كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَـهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (البقرۃ:۲۶۴)

...اس شخص کی طرح جو اپنا مال ریاکاری کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بڑی چٹان جس پر مٹی جمع ہوجائے اس پر تیز بارش ہو اور وہ اسے صاف پتھر چھوڑ دے۔ اس طرح وہ جو کچھ کمائیں گے وہ ان کے ہاتھ نہیں آئے گا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہاں ریا کے ساتھ خدا اور آخرت پر عدم ایمان کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لاص اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ قلب میں ایمان جاگزیں ہو۔ خدا اور آخرت پر مان کے بغیر کسی عمل کا ریاکاری سے پاک ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

ہرت کے لیے خدمت

شہرت سے دنیا کے چاہنے والوں کو دنیا ملتی ہے۔ اس سے آدمی دنیا کے ادات 'باعزت طبقہ' سے حاصل کرتا ہے۔ خدمت خلق شہرت اور نام آوری کا بہترین یعہ ہے۔ کسی کے حق میں اس شہرت کا حاصل ہونا کہ وہ انسانوں کا خیرخواہ اور ان کا مت گزار ہے، اس کے بارے میں حسنِ ظن اور اعتماد پیدا کرتا ہے۔ ایک دنیا دار آدمی سے Cash کرتا ہے، اس سے وہ سوسائٹی میں عزت و توقیر اور عہدہ و منصب خریدتا ہے، ت و ثروت سمیٹتا اور ہر طرح کے مادی فوائد حاصل کرنے کے لیے اسے استعمال کرتا ہے۔ وہ انسانوں کی خدمت اس لیے نہیں کرتا کہ اسے ان سے ہم دردی ہے، بلکہ انھیں ونِ احسان کرکے اپنی مادی اغراض پوری کرنا چاہتا ہے، جہاں اس کا امکان نہ ہو وہاں ں کا جذبۂ خدمت پژمردہ ہو جاتا ہے۔

ہرت کے لیے خدمت کا انجام

شہرت کے لیے کسی کارِ خیر کو انجام دینا خدا کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ اس

سے اس کا غضب بھڑکتا ہے۔ اس پر جو وعید آئی ہے اسے بیان کرتے ہوئے حضر
ابوہریرہؓ پر بار بار غشی طاری ہوگئی اور حضرت معاویہؓ سن کر زار و قطار رونے لگے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا
قیامت میں اللہ تعالیٰ جب بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائے گا
سب سے پہلے تین (طرح کے) آدمیوں کا فیصلہ فرمائے گا۔ ان میں سے ایک تو شہ
ہوگا۔ وہ پیش ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں جو قوت و صلاحیت اور توانائی عطا کی
اسے یاد دلائے گا۔ وہ اس کا اعتراف کرے گا۔ اس پر سوال ہوگا کہ تو نے اس احسان
کیا شکر ادا کیا اور تیری قوت و طاقت کہاں صرف ہوئی؟ عرض کرے گا، اے اللہ! تو
جہاد کا حکم دیا تھا، میں نے اس کی تعمیل کی۔ اپنی قوتوں کو تیری راہ میں لگا دیا اور تیر
دشمنوں سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ ارشاد ہوگا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے ج
اس لیے کیا تھا کہ تمھیں جری اور بہادر کہا جائے۔ دنیا میں تمھاری جرأت اور بہادری
خوب چرچے ہوئے اور تمھاری مراد پوری ہوگئی۔ اس کے بعد حکم ہوگا کہ اسے چہرہ
بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے اور وہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

دوسرا شخص عالم اور قاری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے یاد دلائے گا کہ کیا ہم نے تمھیں
اپنی کتاب کے علم سے نہیں نوازا تھا؟ وہ اسے تسلیم کرے گا۔ سوال ہوگا کہ تم نے اس
کیا شکر ادا کیا؟ عرض کرے گا کہ تو نے مجھے جو علم دیا تھا میں نے اسے پھیلا
قرآن مجید پڑھا، حفظ کیا اور شب و روز اس کی تلاوت کرتا رہا۔ ارشاد ہوگا کہ تم جھو
بول رہے ہو۔ تم نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ تمھیں عالم اور قاری کہا جائے۔ ا
حیثیت سے تمھاری شہرت ہوچکی۔ تمھارا صلہ تمھیں مل گیا۔ حکم ہوگا کہ منہ کے بل گھسی
کر اسے بھی جہنم میں پھینک دیا جائے اور وہ پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص صاحبِ ثروت اور دولت مند ہوگا۔ وہ پیش ہوگا۔ اللہ تع

فرمائے گا۔ کیا ہم نے تمھیں ہر طرح کے مال و دولت سے نہیں نوازا تھا؟ وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا اعتراف کرے گا۔ سوال ہوگا کہ تم نے ان احسانات کا کیا شکر ادا کیا؟ عرض کرے گا۔ میں نے صلہ رحمی کی، نیکی کے کاموں میں خرچ کیا، جس راستے میں بھی پیسہ کا صرف کرنا تجھے پسند تھا، میں نے اس میں صرف کیا۔ ارشاد ہوگا، جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ تمھیں سخی اور داتا کہا جائے۔ یہ ہو چکا۔ دنیا میں تمھاری سخاوت کے چرچے ہوگئے۔ پھر اسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[۱]

خدا کے ان ریا کار بندوں سے، جن امور کے بارے میں سب سے پہلے سوال ہوگا، ان کا تعلق بعض اہم دینی خدمات سے ہے۔ انھیں خدمت خلق کے کام کہنا بھی صحیح ہوگا۔ علم کا پھیلانا اور امورِ خیر میں اپنی دولت کا خرچ کرنا واضح طور پر بندگانِ خدا کی خدمت ہے۔ جہاد اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم و غالب کرنے اور دنیا سے ظلم و جور کو ختم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے یہ بھی خدمتِ خلق ہے۔ ان خدمات کے پیچھے شہرت کی طلب ہو تو صرف یہی نہیں کہ ان کا اجر و ثواب رائیگاں جاتا ہے بلکہ آدمی خدا کے غضب کا نشانہ بنتا ہے۔

اخلاص سے خدمت کا بے پایاں ثواب

جہاں اخلاص ہو وہاں انسان کا دل اپنے جیسے انسانوں سے کسی انعام اور صلے کی تمنا سے پاک ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اعمال کا کوئی دوسرا محرک نہیں ہوتا۔ اس کا انفاق، انسانوں سے اس کی ہم دردی و غم گساری اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کی ثنا خوانی ہوگی اور اس کے قصیدے پڑھے جائیں گے یا وہ

---

[۱] یہ حدیث مسلم میں کسی قدر اختصار کے ساتھ ہے۔ کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ الخ۔ ترمذی میں پوری تفصیل ہے۔ ابواب الزہد، باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ۔ نیز ملاحظہ ہو۔ نسائی، کتاب الجہاد، باب من قاتل لیقال فلان جری۔

اس ہم دردی سے دنیا اور متاعِ دنیا خرید سکے گا، بلکہ اسے وہ اپنا فرض سمجھتا ہے، جذبۂ شکر سے اس کا سر جھک جاتا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کی خدمت کی اسے توفیق بخشی۔ سورۂ دہر میں ان بے غرض انسانوں کے جذبات کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْناً وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لاَ نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلاَ شُكُوْرًا○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا○ (الدھر:۸-۱۰)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم صرف اللہ کی خوش نودی کے لیے کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کا ڈر ہے جو سخت اور طویل ہوگا۔

ان آیات کے بعد ان انعامات کا ذکر ہے، جن سے اللہ تعالیٰ اپنے ان مخلص بندوں کو نوازے گا۔ کردار کی یہ بلندی، خدمت کے ساتھ یہ خاک ساری صرف اخلاص سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی دوسرے محرک میں یہ قوت اور توانائی نہیں ہے۔

ان نیک اور خدا ترس بندوں کے بارے میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ○ (آل عمران:۱۳۴)

... جو خوش حالی اور تنگی میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہاں اصحابِ تقویٰ کی دو خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تنگی اور ترشی ہر حال میں انفاق کرتے ہیں، دوسری یہ کہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ ان دونوں خوبیوں میں بڑی مناسبت محسوس ہوتی ہے۔ آدمی ہاتھ بڑھا کر خرچ کرتا ہے تو اس کے اندر بڑائی کا احساس ابھرنے لگتا ہے۔ وہ کم از کم ان لوگوں کو، جن پر احسان کرتا ہے فروتر خیال کرتا ہے۔ ان سے کوئی گستاخی اور بے ادبی، اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ان کی غلطیوں کو معاف کرنا اور ان کی خدمت کرتے رہنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں کہ بے پناہ انفاق کے باوجود اللہ کے

بندوں میں خاک ساری اور فروتنی پائی جاتی ہے۔ وہ کسی کو نشانۂ ملامت بنانے اور اُسے رسوا کرنے کے بہانے نہیں تلاش کرتے بلکہ خطا کاروں کو بھی معاف کر دیتے ہیں۔ وہ کسی کی خدمت سے اس لیے ہاتھ نہیں روک لیتے کہ اس نے ان کے ساتھ زیادتی کی۔ لوگوں کی زیادتیوں سے ان کا خدمت سلسلۂ خدمت ٹوٹتا نہیں بلکہ جاری رہتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔

احسان جتا کر ثواب ضائع نہ کیا جائے

اسی کا دوسرا پہلو ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ والے انفاق کے بعد احسان نہیں جتاتے۔ احسان جتانا کم ظرفی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کی طبعِ بلند عطا کرتا ہے اور اس کم زوری میں اسے مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لا لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○
(البقرۃ:۲۶۲)

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غم میں مبتلا ہوں گے۔

خدا فراموش انسان کسی پر احسان کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ اس کا اعتراف کرے، اس کا ممنونِ احسان ہو، اس کا دعا گو رہے، اس کی خدمت کرے، اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئے، اس کے جود و سخا اور نوازشات کا چرچا کرے، اس کے مطالبات پورے کرے، اس کی چشم و ابرو کے اشاروں کو سمجھے اور اس کے احکام کی تعمیل کرے۔ جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو وہ اسے ذلیل کرنے پر اتر آتا ہے، اس کی تنگ دستی اور اپنے احسان کا بار بار ذکر کر کے اسے اذیت پہنچاتا ہے اور کچوکے لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہ ذہنی اور روحانی اذیت کسی بھی شریف انسان کے لیے جسمانی اذیت سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔

احسان جتا کر کسی کی خودی کو مجروح کرنے سے قرآن مجید کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ آدمی دو میٹھے بول بول کر معذرت کردے۔ اس سے اس کی عزتِ نفس پامال نہ ہوگی اور وہ محسوس کرے گا کہ اس کا سابقہ ایک ہم درد اور شریف انسان سے ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى ؕ وَّاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○ (البقرة:۲۶۳)	نرمی سے جواب دینا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت ہو۔ اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

کسی عملِ خیر کے بعد احسان جتانا اسے ضائع کرنا ہے، اس لیے اس نے تاکید فرمائی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰىۙ (البقرة:۲۶۴)	اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع مت کرو۔

حدیث میں احسان جتانے پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولهم عذاب اليم. المنّان الذى لا يعطى شيئا الا منّه والمنفق سلعته بالحلف الفاجر والمسبل ازاره[1]	تین قسم کے انسان ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ بات کرے گا اور نہ انھیں دیکھے گا اور انھیں درد ناک عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک ہے احسان جتانے والا جو کسی کو کچھ دیتا ہے تو اس کا احسان جتاتا ہے۔ دوسرا ہے جھوٹی قسم کھا کر اپنا سامان بیچنے والا۔ تیسرا ہے (تکبر سے) اپنا تہہ بند زمین پر لٹکانے والا۔

کم ظرف انسان، احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنی عظمت تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ عظمت ان افراد کے حصے میں آتی ہے جو کسی صلے کی تمنا سے بے نیاز ہو کر انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ یہی انسانوں کے محبوب ہیں اور یہی خدا کے محبوب۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار الخ

کتاب کے مآخذ

کتاب میں جن مآخذ کا حوالہ دیا گیا ہے، ذیل میں ان کے مصنّفین، مطابع اور سنینِ طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے، البتہ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے سلسلے میں اس تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۱۔		قرآن مجید (منزل من اللہ)	

تفسیر

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۲۔	فخر الدین محمد الرازی (امام رازی)	مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)	دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ۱۹۹۰ء
۳۔	عماد الدین اسمٰعیل (ابن کثیر)	تفسیر القرآن العظیم	مطبعۃ مصطفیٰ احمد مصر ۱۳۵۶ھ
۴۔	محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی (علامہ بغوی)	معالم التنزیل	دار الکتب العلمیۃ
۵۔	علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی (خازن)	لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف بالتفسیر الخازن	لبنان، ۱۹۹۵ء

حدیث

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۶۔	محمد بن اسمٰعیل (الامام البخاری)	صحیح البخاری	

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
۷-	ابوالحسین مسلم بن الحجاج (الامام مسلم)	صحیح مسلم	
۸	سلیمان بن اشعث السجستانی (الامام ابوداؤد)	سنن ابی داؤد	
۹-	ابوعیسیٰ الترمذی	جامع الترمذی	
۱۰-	ابوعبدالرحمٰن احمد بن اشعث النسائی	سنن النسائی	
۱۱-	ابوعبداللہ ابن ماجہ	سنن ابن ماجہ	
۱۲-	الامام ابوعبداللہ مالک بن انس	مؤطا مالک مع شرحہ تنویر الحوالک	عیسی البابی حلبی وشرکاؤہ، مصر ۱۳۴۳ھ
۱۳-	الامام احمد بن حنبل	المسند للامام احمد	المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۱۳ھ
۱۴-	محمد بن اسمٰعیل البخاری	الادب المفرد مع شرحہ فضل اللہ الصمد	المطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۷۸ھ
۱۵-	احمد بن الحسین بن علی البیہقی	السنن الکبریٰ	دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد ۱۳۵۵ھ
۱۶-	عبدالعظیم بن عبدالقوی (المنذری)	الترغیب والترہیب من الحدیث الشریف	دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۶ء
۱۷-	ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی	مشکوٰۃ المصابیح	اصح المطابع، لکھنؤ

شروح حدیث

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر
۱۸-	ابوسلیمان احمد بن سلیمان محمد الخطابی	معالم السنن	المطبعۃ العلمیہ حلب ۱۳۵۱ھ
۱۹-	محی الدین ابوزکریا یحییٰ (النووی)	شرح صحیح مسلم	اصح المطابع، دہلی ۱۳۴۹ھ

۱-	شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی ابن حجر العسقلانی	فتح الباری بشرح صحیح البخاری	المطبعۃ الخیریہ، مصر ۱۳۲۹ھ
ا-	عبد الرؤف المناوی	التیسیر بشرح الجامع الصغیر	دار الطباعۃ العامرہ مصر ۱۲۸۶ھ
۲-	محمد بن عبد الباقی بن یوسف الزرقانی	شرح الموطا للامام مالکؒ	المطبعۃ الخیریۃ۔ مصر
۲۱-	محمد بن علی بن محمد الشوکانی	نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار	ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۴ھ

ـہ وفتاویٰ

۲۱-	برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی	الہدایہ (شرح بدایۃ المبتدی)	مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۳۱ء
۲-	ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود النسفی	کنز الدقائق	مطبع القاسمی، دیوبند
۲-	محمد علاء الدین الحنفی	الدر المختار شرح تنویر الابصار	مطبعۃ عثمانیہ، مصر ۱۳۲۷ھ
۲-	محمد امین الشہیر بابن عابدین	رد المختار علی الدر المختار	مطبعۃ عثمانیہ، مصر ۱۳۲۷ھ
۲-	محمد بن احمد بن محمد بن احمد (ابن رشد القرطبی)	بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد	قاہرہ ۱۹۲۸ء
۳-	ابو عبد اللہ بن احمد بن محمد (ابن قدامۃ المقدسی)	المغنی علی مختصر ابی القاسم الخرقی	مکتبہ ریاض، ۱۹۸۱ء
۳-	عون الدین ابو المظفر یحییٰ بن محمد (ابن ہبیرۃ الحنبلی)	الافصاح عن معانی الصحاح	مطابع الدجوی عابدین، القاہرہ۔
۳-	تقی الدین احمد (ابن تیمیہ الحرانیؒ)	مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ	دار العربیہ، بیروت ۱۳۹۸ھ

ـیرت وتاریخ

۳۱-	ابن سعد	الطبقات الکبریٰ	طبع بیروت ۱۹۶۰ء

۳۳- ابو محمد عبد الملک ابن ہشام — سیرۃ النبیؐ تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید — مطبعۃ الحجازی قاہرہ ۱۹۳۷ء

۳۴- محی الدین ابو زکریا یحییٰ النووی — تہذیب الاسماء واللغات — ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مص

لغت

۳۵- مجد الدین محمد بن یعقوب (فیروز آبادی) — القاموس المحیط مع حواشی ابو الوفا نصر الھویتی — دار الکتب العلمیۃ بیرو ۲۰۰۴ء

۳۶- مجد الدین ابو السعادۃ المبارک المعروف بابن اثیر الجزری — النہایہ فی غریب الحدیث — المطبعۃ العثمانیہ، مصر ۱۳۱۱

۳۷- ابو الفضل جمال الدین ابن منظور الافریقی — لسان العرب — طبع بیروت ۱۹۵۵ء

۳۸- العلامۃ عبد الحمید الفراہی — مفردات القرآن تحقیق الدکتور محمد اجمل اصلاحی — دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلا سرائے میر، اعظم گڑھ ۰۴

کتاب میں مصنف کی حسبِ ذیل کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں:

۳۹- 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

۴۰- 'اسلام- انسانی حقوق کا پاسبان' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

۴۱- 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

کتاب میں مصنف کے حسب ذیل مقالات کا ذکر ہے:

۴۲- 'اہل ایمان کے باہمی تعلقات' ماہ نامہ زندگی نو۔ جنوری ۱۹۸۹ء

۴۳- 'کم زور- اسلام کے سایہ میں' ماہ نامہ زندگی رام پور۔ اگست، ستمبر ۱۹۷۸ء

۴۴- 'اسلام- کم زور کی ظلم سے حفاظت کرتا ہے' سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۸۳

۴۵- 'محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات' سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۹۸۷